اسطور کی تاریخ

کیرن آرمسٹرانگ

ترجمہ: ناصر عباس نیر

مشعل

اسطور کی تاریخ

کیرن آرمسٹرانگ

ترجمہ: ناصر عباس نیئر

مشعل بکس

آر-بی5' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور-54600، پاکستان

اسطور کی تاریخ

کیرن آرمسٹرانگ

ترجمہ: ناصر عباس نیئر

کاپی رائٹ اردو © 2013 مشعل بکس

کاپی رائٹ © 2005 کیرن آرمسٹرانگ

ناشر: مشعل بکس

آر-بی-5، سیکنڈ فلور،

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور-54600، پاکستان

فون و فیکس: 042-35866859

Email: mashbks@brain.net.pk

http://www.mashalbooks.org

www.MashalBooks.org

فہرست

پیش لفظ ناصر عباس نیّر 5

اسطور کیا ہے؟ 15

آغاز حجری دور: شکاری قبائل کی اساطیر 23
(20000 ق م تا 8000 ق م)

اواخر حجری دور: دہقانوں کی اساطیر 41
(8000 ق م تا 4000 ق م)

ابتدائی تہذیبیں 51
(4000 تا 800 ق م)

محوری عہد 63
(800 تا 200 ق م)

مابعد محوری عہد 79
(200 ق م تا 1500ء)

عظیم مغربی کایا کلپ 87
(1500 تا 2000ء)

حوالہ جات 105

www.MashalBooks.org

پیش لفظ

گزشتہ بیس برسوں میں یورپ کے جن مصنفین کو مذاہب کے تقابلی و تاریخی مطالعات پر مبنی تحریروں کی بنا پر عالمی شہرت ملی ہے، ان میں کیرن آرمسٹرانگ (پ: ۱۹۴۴) ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ ہر چند یورپ میں مذاہب کے تقابلی مطالعات کی روایت صدیوں پرانی ہے اور مشرق و مغرب کے مذاہب کے امتیازات و اشتراکات پر قلم اٹھانے والے مغربی مصنفین کے کئی گروہ ہیں۔ تاہم ان میں دو گروہ خاص طور پر اہم ہیں۔ ایک گروہ میں وہ مستشرقین شامل ہیں جنھوں نے نوآبادیاتی عہد میں مشرقی مذاہب کا مطالعہ کیا۔ ان کے مطالعات کی علمیاتی بنیاد استشراق کی وہ روایت ہے جس میں مذہبی و غیر مذہبی علم طاقت کے ڈسکورس کا حصہ بنتا ہے۔ دوسرا گروہ سرد جنگ کے خاتمے اور گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد خاص طور پر امریکا میں سامنے آیا ہے۔ یہ گروہ مذہب اور خصوصاً اسلام کا مطالعہ تہذیب کے اس خاص تصور کے تحت کرتا ہے جسے برنارڈ لیوس اور ہنٹنگٹن نے پیش کیا۔ گیارہ ستمبر کے بعد کے امریکا میں، بہ قول محمود ممدانی تہذیب کی گفتگو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کی جاتی ہے اور مجموعی طور پر مسلمانوں کو مقلدِ محض، تہذیب دشمن (تہذیب کے مغربی معیارات کے تحت)، دہشت گرد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس تناظر میں کیرن آرمسٹرانگ کی مذہبی تحریروں کی خاص اہمیت ہے۔ ان کی شہرت کا آغاز ۱۹۹۳ میں اس وقت ہوا، جب ان کی کتاب ''خدا کی تاریخ: یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی چار ہزار سالہ جستجو'' شایع ہوئی۔ اگرچہ وہ اپنے تصنیفی کیریر کا آغاز ۱۹۸۲ میں کر چکی تھیں، جب ان کی کتاب Through the Narrow Gate چھپی تھی، اور جس میں انھوں نے راہبہ کے طور پر اپنے تجربات لکھے

تھے۔ ''خدا کی تاریخ'' میں انھوں نے تینوں سامی مذاہب کا تاریخی ارتقائی مطالعہ کیا تھا۔ (اسی بنا پر انھیں مذہبی مصنف بھی کہا جاتا ہے)۔ اس ضمن میں جو چیز کیرن آرمسٹرانگ کی کتاب کو اہم بناتی تھی، وہ استشراق اور سرد جنگ کے بعد کے زمانے کے 'سیاسی تہذیبی اسلام' کے ڈسکورس سے بیگانگیت تھی۔ اس امر کا ثبوت یہ بھی ہے کہ مذکورہ کتاب کی اشاعت سے ایک برس پہلے وہ حضرت محمد ؐ کی سوانح لکھ چکی تھیں۔

انھوں نے ۱۹۸۴ میں سینٹ پال پر ٹیلی ویژن کے لیے ایک دستاویزی فلم بھی تیار کی؛ اس کے لیے انھوں نے مقدس مقامات کا سفر کیا جسے وہ اپنی زندگی کا سنگِ میل قرار دیتی ہیں۔ یہ سفر ان کی زندگی کا دوسرا اہم واقعہ تھا، جس نے ان کو روح کی گہرائیوں سے متاثر کیا۔ ایک طرح سے ان کے لیے یہ سفر ''گھر واپسی'' کا تجربہ بنا۔ پہلا واقعہ 'سسٹر آف دی ہولی چائلڈ کرسٹ' کا رکن بننا تھا جو رومن کیتھولک چرچ نے ۱۸۴۶ میں انگلستان میں قائم کیا تھا۔ تب ان کی عمر اٹھارہ برس کے لگ بھگ تھی اور وہ سات برس تک وہاں رہیں۔ اس واقعے نے ان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اپنے ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ انھیں ان برسوں میں سخت جسمانی اور نفسیاتی اذیت سے گزرنا پڑا۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے بہ طور راہبہ مذہب اور مذہبی ادارے کو ایک عقوبت خانے کے طور پر تجربہ کیا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ مذہب ہی سے برگشتہ ہو جاتیں؛ مذہب ان کے لیے ایک ڈراؤنے خواب کی طرح ہو جاتا اور وہ اپنے قلم کو عیسائیت پر نامختتم تنقید کے لیے استعمال کرتیں۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ ''میں نے کبھی خیال نہیں کیا تھا کہ اس تجربے کے بعد کبھی مذہب کی طرف پلٹوں گی، مگر دوسرے عقائد کی روایت کے مطالعے نے مجھے واپس مذہب کی طرف پھیر دیا۔'' وہ کیتھولک خانقاہ میں خدا کا تجربہ کرنے گئی تھیں، مگر وہاں راہبائیں تھیں جن کے پاس خدا کے نام کو اپنی ایذا پسندی کے بے لگام اظہار کے لیے استعمال کرنے کی آزادی تھی، مگر ان کے دلوں میں وہ روشنی، دردمندی، محبت، ایثار نہیں تھا جو خدا کے نبی کے پیغام میں تھا۔ کیرن آرمسٹرانگ نے جب دیگر مذاہب کا مطالعہ کیا تو انھیں اس خدا کا تجربہ ہوا جسے وہ خانقاہ میں تلاش کرنے گئی تھیں۔ گویا انھیں خدا، خدا کے نام پر بنائے گئے ادارے میں نہیں، خدا کے پیغام پر مبنی کتابوں کے گہرے مطالعے سے ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا ان کی مذہبی فکر کی مرکزی حقیقت ہے، جسے وہ سینٹ ٹامس اکونائیس کے مطابق ''وجود'' نہیں سمجھتیں کہ وجود ہمیشہ محدود اور زمان

www.MashalBooks.org

ومکاں کا پابند ہوتا ہے؛ وہ خدا کو ایک ماورائی تجربہ خیال کرتی ہیں۔ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ مذہب کی زبان کو ہمیشہ خود سے بالاتر ہوتے ہوئے، ماورائیت کی خاموشی کی طرف اشارہ کرنا چاہیے۔ بہ صورتِ دیگر مذہب بت پرستی بن جاتا ہے۔ مذہبی تجربے کا یہ ایک نہایت گہرا نکتہ ہے۔ حضرت علیؓ سے ایک قول منسوب ہے کہ خدا کی تمام صفات خدا کی حقیقت کو بیان کرنے کے سلسلے میں گنگ ہیں۔ خدا ان صفات سے بھی ماورا ہے جو دراصل لسانی حقیقت ہیں۔ جو لوگ اس لسانی حقیقت کے پار اس پر ہیبت سکوت کا تجربہ نہیں کر سکتے، جو ماورایئت کا دوسرا نام ہے اور خود کو مذہبی زبان کی حدوں میں مقید رکھتے ہیں انہی کے یہاں بت پرستی جنم لیتی ہے۔ وہ خدا کی عبادت نہیں کرتے، کسی ایک صفت، خواہ وہ مجسم ہو یا غیر مجسم، ایک استعارہ ہو، اس کی پرستش کرتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے مذہب کے صوفیانہ اور روحانی پہلو کو دریافت کیا۔ ہمدردی اور شفقت ان کی تمام تحریروں کی بنیادی اصطلاحوں کے طور پر سامنے آئے جن کی اصل حضرت عیسیٰؑ کی بنیادی تعلیم ہے۔ رہبانیت ترک کر کے انھوں نے سینٹ اینیز کالج، اوکسفرڈ میں انگریزی میں داخلہ لیا۔ انگریزی کے مطالعے کا انتخاب صاف طور چرچ کی دنیا کے تجربے کا ردعمل محسوس ہوتا ہے۔ کیرن آرمسٹرانگ نے ایک راہبہ کے طور پر دیگر راہباؤں کا ایک بھیانک چہرہ دیکھا تھا۔ ایک نوجوان تجرد شعار لڑکی کے لیے یہ سمجھنا خاصا فطری ہوگا کہ اس 'بھیانک چہرے' کو خدوخال 'مذہبی زندگی' ہی نے دیے ہیں۔ شاید اسی لیے وہ ادب کی دنیا میں داخل ہوئی، جو حقیقتاً سیکولر دنیا ہے۔ مگر یہاں بھی ایک المیہ منتظر تھا۔ انھوں نے ٹینی سن پر پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ یونیورسٹی کمیٹی کی منظوری سے لکھا، مگر اس مقالے کے خارجی ممتحن نے اس موضوع کو غیر موزوں قرار دے کر مسترد کر دیا۔ یوں انھیں ایک اور طرح کی نفسیاتی اذیت کا سامنا کرنا پڑا؛ خراب صحت کی وجہ سے وہ جسمانی تکلیف پہلے ہی سہ رہی تھیں۔ اعلیٰ تعلیمی کیریئر میں ناکامی نے انھیں دل برداشتہ کیا۔ تاہم انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ یہ بات خارج از امکان نہیں کہ خراب صحت اور جسمانی ونفسیاتی اذیتوں ہی نے انھیں مذہب سے گہری باطنی وابستگی پر مائل کیا۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ جسمانی معذوری، مستقل افلاس، سماجی دھتکار وغیرہ آدمی کے اندر جن خطرات، عدم تحفظ کی کیفیات اور اندیشہ ہائے دور دراز کو جنم دیتے ہیں، ان سے بچاؤ کے لیے آدمی عموماً مذہب سے رجوع کرتا ہے۔ دیگر مذہب کے مطالعے کی جستجو کا سبب بھی ان کے ذاتی الم ناک صورت حال ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک لڑکیوں کے سکول میں پڑھاتی رہیں۔ آج کل یہودیت کے

مطالعے کے لیے قائم لندن کے لیو بیک کالج میں پڑھاتی ہیں اور دی گارڈین کے لیے لکھتی ہیں۔ جیسس سیمینار کی فلیو ہیں، جس کا مقصد حضرت عیسیٰؑ کی زندگی اور تعلیمات پر تحقیق ہے۔

کیرن آرمسٹرانگ کی کتابوں کی تعداد بیس تک پہنچتی ہے۔ ان میں زیادہ تر کتابوں کا موضوع چند مذاہب عالم اور مذہبی تجربے کا مطالعہ ہے۔ انھوں نے یہودیت، عیسائیت، اسلام کے علاوہ بدھ مت اور ہندو مت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ظاہر ہے دنیا میں ان کے علاوہ بھی مذاہب موجود ہیں۔ مثلاً سکھ مت، تاؤ مت، کنفیوشس مت، افریقی اساطیری مذاہب وغیرہ۔ تاہم ان کے چند مذاہبِ عالم کے مطالعات سے ایک اہم بات یہ واضح ہوتی ہے کہ وہ اپنے آبائی مذہب عیسائیت پر قائم رہتے ہوئے دیگر مذہبی روایات کا ایک ایسا مطالعہ کرنے میں کامیاب ہیں جس کا مقصود نہ تو اپنے آبائی مذہب کی حتمی صداقت کو باور کرانا ہے اور نہ دوسرے مذاہب یا ان کے ماننے والوں کو گم راہ ثابت کرنا ہے، بلکہ ان سب کے اندر ایک مشترک اساس کی دریافت ہے جسے وہ کبھی اخلاقی کیمیا، کبھی ہمدردی کا نام دیتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کے یہاں مبلغانہ جوش وخروش نہیں پایا جاتا۔ دوسری وجہ 'مذہبی تجربہ' ہے۔ چوں کہ خانقاہی عقوبت خانے کے جس خوف ناک تجربے نے ان کا دل مذہب سے پھیر دیا تھا، اس کے اثرات کو مٹانے کا کام دیگر مذاہب کے مطالعے نے کیا تھا، اس لیے ان کے دل میں دیگر مذاہب کے احترام کا پیدا ہونا عین فطری تھا۔ مذہبی تجربہ نہ صرف انھیں تمام مذہبی نظاموں میں مشترک نظر آتا ہے بلکہ اسے فرد کی باطنی زندگی کے لیے ایک اہم ترین یافت اور قدر بھی سمجھتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ مذہب کو ایک روحانی تجربے کے طور پر لیتی ہیں۔ مذہب کے ساتھ سیاست اور طاقت کے جو تصورات وابستہ ہوتے اور ان کا اظہار ایک یا زیادہ سماجوں پر غلبے کی صورت ہوتا ہے، اس کی تاریخ تو بیان کرتی ہیں، (جیسے ''خدا کے لیے جنگ'' میں) مگر اسے مذہب کی روح میں شامل نہیں کرتیں۔ انھیں ۲۰۰۸ میں TED انعام دیا گیا۔ ۱۹۸۴ میں قائم ہونے والی Technology, Entertainment, Design نامی یہ کانفرنس ''اشاعت کے لائق'' نظریات کے فروغ میں سرگرم ہے۔ اس غیر سرکاری رفاہی تنظیم کی طرف سے کیرن آرمسٹرانگ کو ایک لاکھ ڈالر کی رقم پیش کرنے کے ساتھ کہا گیا کہ وہ اپنی'' واحد خواہش، دنیا کو تبدیل کرنے'' کی بتائیں۔ ان کا جواب تھا: ہمدردی (Compassion)۔ انھوں نے کہا کہ وہ دنیا کے راہنماؤں کے ساتھ مل کر ''ہمدردی کا میثاق'' پر

www.MashalBooks.org

کام کرنا چاہتی ہیں۔ انٹرنیٹ کے ذریعے سوملکوں کے ہزاروں لوگوں نے مل کر یہ میثاق لکھا جس کی آٹھ ہزار افراد نے توثیق کی ہے، اور اسے ہر مکتبہ ءفکر لے لوگ پیش کرنے اور عمل کرنے میں کوشاں ہیں۔ ۲۰۱۱ میں کیرن جب پاکستان کے لٹریری فیسٹول میں شرکت کی غرض سے کراچی آئیں تو انھوں نے زیادہ تر باتیں اسی ''چارٹر آف کمپاشن'' کے حوالے سے کیں اور انھیں پھر ''پاکستان کے نام خط'' میں کتابی صورت بھی دی۔ دنیا کے تمام انسانوں اور مخلوقات کے لیے غیر مشروط ہمدردی محض ایک تصور نہیں جو مذہب کے اوامر ونہی کے مطالعے سے اخذ ہوتا ہے، بلکہ یہ مذہبی تجربے کی کوکھ سے پھوٹنے والا سماجی طرز عمل ہے۔

''اسطور کی تاریخ'' (۲۰۰۵) بڑی حد تک کیرن آرمسٹرانگ کے مذہبی مطالعات ہی کی ایک کڑی ہے۔ سات مختصر ابواب پر مشتمل اس کتاب میں اساطیر اور اسطوری طرزِ فکر کی تاریخ اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ مذہبی اور اساطیری طرزِ فکر میں کسی قابلِ لحاظ فرق کی نشان دہی نہیں کرتیں۔ قلبِ ماہیت کو وہ مذہب اور اساطیر میں قدرِ مشترک قرار دیتی ہیں۔ قلبِ ماہیت ایک ہمہ گیر داخلی تجربہ ہے جو آدمی کے احساس، خیال اور فکر کو مستقل طور پر بدل دیتا ہے۔ آغاز حجری دور سے محوری عہد تک دنیا کے مختلف خطوں کے لوگ اس تجربے کو اپنی زندگی کی قیمتی متاع خیال کرتے رہے، تاہم ان کے یہاں اس تجربے کے سلسلے میں خود شعوریت نہیں تھی۔ خود شعوریت تو دوئی کا نتیجہ ہے: تجربے اور تجربے کرنے والے کے درمیان۔ مگر جس عہد کو جرمن فلسفی کارل جیسپرس نے محوری عہد کا نام دیا ہے، جو ۸۰۰ تا ۲۰۰ ق م کا زمانہ ہے، بنیادی اور محوری تبدیلیوں کا زمانہ ہے۔ دنیا کے اکثر جدید مذاہب کا آغاز اسی دور میں ہوا اور وہ مذاہب آج بھی دنیا کو سمجھنے، برتنے اور اس کی تشکیل کرنے میں کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس دور میں حجری اور زرعی عہد کی اساطیر پر سوال قائم کیے جانے لگے، تاہم بعض اساطیر کو ترمیم وتبدیلی کے ساتھ شامل بھی رکھا گیا۔ کیرن آرمسٹرانگ کے مطابق اساطیر کے سلسلے میں فیصلہ کن تبدیلی سولھویں صدی عیسوی سے رونما ہونا شروع ہوئی، جب مغرب میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا، جس کی مرکزی فکر کو روشن خیال اور جدیدیت نے آگے بڑھایا۔ اس عہد میں اساطیر پر محوری عہد کی طرح سوال قائم نہیں کیے گئے بلکہ انھیں غیر عقلی، جھوٹی کہانیاں، خرافات کہا جانے لگا۔ یہاں کیرن اپنے نقطہ ءنظر کی وضاحت میں دو اصلاحات کو کثرت سے استعمال کرتی ہیں: میتھوس اور لوگوس۔ ہر چند ان کا ٹھیک

ٹھیک اردو ترجمہ محال ہے، تاہم آسان لفظوں میں اول الذکر کو اسطوری فکر اور ثانی الذکر کو منطقی فکر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کیرن آرمسٹرانگ ان دونوں اصطلاحوں کو ایک دوسرے کی ضد سمجھتی ہیں۔ چناں چہ ان کے نزدیک جدیدیت کی منطقی فکر نے اپنے معانی قائم کرنے اور اپنے دائرہ ءعمل کا تعین کرنے کے لیے محوری عہد تک کی اسطوری / مذہبی فکر کو بے دخل کرنا ضروری سمجھا۔ سولھویں تا اکیسویں صدی کے زمانے کو وہ کم یا زیادہ منطقی فکر کا حامل سمجھتی ہیں جس میں متھ یا اسطور کا لفظ جھوٹ، باطل، فرضی کہانی کے معنوں میں استعمال ہونے لگا؛ اسطور کے وہ مفاہیم غائب ہوتے چلے گئے جن کے مطابق ''اسطور نامعلوم سے متعلق ہے؛ یہ اس شے کے بارے میں ہے جسے ہم ابتداً لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوتے ہیں؛ اسطور کہانی برائے کہانی نہیں ہے، یہ ہمیں زندگی کرنے کا ڈھنگ سکھاتی ہے؛ یہ ہمیں ایک دوسرے منطقے کی خبر دیتی ہے جو ہماری دنیا سے ملحق اور ایک طرح سے اسے سہارا دیے ہوئے ہے؛ نیز وہ غیر مرئی مگر انتہائی پر اثر حقیقت جسے بعض اوقات دیوتاؤں کی دنیا کہا گیا ہے، اساطیر کا موضوع ہے''۔

کیرن آرمسٹرانگ، جدیدیت کی منطقی فکر کے اسطوری / مذہبی فکر پر غلبے کو انسانی فکر میں ایک ایسی تبدیلی نہیں سمجھتیں جو گزرانِ وقت کے ساتھ ناگزیر تھی، یا انسانی ثقافتی مساعی کی فطری منزل تھی۔ وہ یہاں ایک مورّخ سے زیادہ اسطوری فکر کی مناد نظر آتی ہیں۔ ان کی نظر میں اسطوری فکر کی پسپائی سے جدیدیت کی منفی قوتوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ دوسرے لفظوں میں جب تک اسطوری فکر یعنی میتھوس اجتماعی زندگی پر حاوی تھی، انسان پر امن زندگی بسر کر رہا تھا۔ لوگوس کی حاکمیت نے انسان کو جنت بدر کر دیا۔ کتاب کے آخری باب کے بیش تر مباحث وہی ہیں جو ہمیں رینے گینوں، شواں اور مارٹن لنگز کے زیر اثر محمد عسکری کی ادبی زندگی کے آخری دور میں ملتے ہیں، خصوصاً ان کی کتاب ''جدیدیت، مغربی گم راہیوں کا خاکہ'' میں۔ یہاں کیرن صاف طور پر رینے گینوں کی فکر کے بے حد قریب محسوس ہوتی ہیں۔ وہ رینے گینوں اور ان کے شارح حسن عسکری کی طرح عہد وسطیٰ اور ان سے پہلے زمانوں کو زریں عہد سمجھتی ہیں۔ وہ لوگوس یا منطقی فکر کو جدید عہد کے تمام بڑے المیوں، مثلاً عظیم جنگوں کی تباہیوں سے لے کر گیارہ ستمبر کے واقعے تک کی جڑوں کو لوگوس میں اور اسطوری فکر سے سنگ دلانہ لاتعلقی میں تلاش کرتی ہیں۔ ہماری نظر میں یہاں کیرن آرمسٹرانگ اس مغالطے کی زد پر محسوس ہوتی ہیں، جو اسطوری اور منطقی فکر میں ضد مخالف

www.MashalBooks.org

کا رشتہ قائم کرنے سے عبارت ہے۔ جب آپ دونوں کو ایک دوسرے کی حریف قرار دیں گے تو ایک کی خوبیاں لازماً دوسری کی خامیاں نظر آئیں گی اور وہ دو ایسی تلواروں کی طرح محسوس ہوں گی جو ایک میان میں نہیں سما سکتیں؛ وہ بس ایک دوسرے پر تانی جا سکتی ہیں۔ یعنی جب آپ افکار و اشیا میں ضدِ مخالف کا رشتہ قائم کرتے ہیں، ان میں درجہ بندی بھی قائم کرتے ہیں؛ ایک برتر اور دوسرا کم تر ہوتا ہے اور پہلے کی برتری کے معیار ہی سے دوسرا کم تر ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں سوال جدید مغربی تاریخ کی اصل حقیقت سے زیادہ اس حقیقت کی تفہیم و تعبیر کا ہے۔ جب قرونِ وسطیٰ کو اسطوری / مذہبی فکر کے حامل ہونے کی بنا پر سنہری زمانہ قرار دیا جاتا ہے تو یہ ایک تجربی سچائی کا اظہار نہیں، بلکہ مذہبی فکر کو منطقی فکر سے مختلف اور برتر سمجھنے کی 'ذہنی سچائی' کا اظہار ہے۔ یہ ذہنی سچائی، استحصال و مظالم کی ان تمام صورتوں پر پردہ ڈال دیتی ہے جو چرچ کی اجارہ داری کے دنوں میں عروج پر تھیں اور جنھوں نے انسانی آزادی کا گلہ گھونٹ دیا تھا؛ آفات و مصائب کو من جانب خدا قرار دے کر اس انسانی ذمہ داری کا تصور بھی پیدا نہیں ہونے دیا تھا جو ان کے اسباب کی تحقیق کرنے اور ان پر قابو پانے کی انسانی بساط کو لازماً بروے کار لانے سے وابستہ تھا۔

انسانی تاریخ میں جنگیں، قحط، آفات، وباؤں کے ہول ناک واقعات اوّل روز سے ملتے ہیں، اسی طرح انسانی محنت اور وسائل کے استحصال کی مختلف صورتیں بھی قدیم حجری دور سے آج تک چلی آتی ہیں۔ انسان نے دوسرے انسانوں اور جانوروں کو قتل کرنے کے آلات اس وقت بھی ایجاد کیے جب اسطوری فکر کا غلبہ تھا اور آج بھی ایجاد کرتا چلا جا رہا ہے جب بہ قول کیرن آرمسٹرانگ لوگوس کی اجارہ داری ہے۔ تباہ کن ٹیکنالوجی کی ایجاد کو صرف جدیدیت اور اس کی عقلیت پسندی سے منسوب کرنا، اسطوری اور منطقی فکر میں ضدِ مخالف کا رشتہ قائم کرنے کے مغالطے ہی کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جدید اور مابعد جدید عہد میں انسانی تباہی اس بڑے پیمانے پر ہوئی ہے جس کی مثال گزشتہ کسی عہد میں تلاش کرنا مشکل ہے، مگر اس کا سبب نہ تو لوگوس ہے اور نہ جدیدیت؛ اس کا باعث ٹیکنالوجی کا انسان پر حاوی ہونا ہے۔ جدید عہد میں انسان نے اتنی بڑی اور اتنے بڑے پیمانے پر ٹیکنالوجی ایجاد کی کہ خود اس کا موجد اس کے آگے بے بس ہو گیا۔ اسطوری زمانوں میں ٹیکنالوجی کا حجم اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ انسان پر حاوی ہو سکتی۔ ایک تیر پر اور اس سے برپا ہونے والی تباہی کے حجم پر ایک فرد کا مکمل اختیار ہو سکتا ہے، مگر

ایک میزائل پر اختیار کم ہو جاتا اور اس سے برپا ہونے والی تباہی پر تو بالکل اختیار نہیں رہ جاتا۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ اگر انسانی و حیوانی جان، انسانی آبرو اور املاک کی تباہی اوسط درجے کی ہو اور کبھی کبھار ہو تو وہ بڑی خبر ہوتی ہے اور انسانی احساسات میں ہلچل مچاتی ہے، لیکن جب تباہی کا حجم بڑھ جائے اور وہ معمول بن جائے تو وہ معمولی خبر ہوتی ہے؛ محض حسابی ہو جاتی ہے اور ایک طرح سے بے حسی کو جنم دیتی ہے۔

جہاں تک جدیدیت کے زیر اثر اسطوری فکر کی پسپائی کا تعلق ہے، اس میں جزوی سچائی ہے۔ ہماری رائے میں صرف مغرب ہی میں نہیں دنیا بھر میں اسطوری اور منطقی فکر ساتھ ساتھ موجود ہیں اور ان میں تعلق ضدِ مخالف کا نہیں۔ البتہ موجودہ انسانی ثقافت کے زیادہ تر ادارے لوگوس کے زیرِ اثر ہیں، مگر جہاں تک دنیا کو سمجھنے اور برتنے کا سوال ہے، انسانی رشتوں کا نبھانے، سماجی تعلقات کو قائم رکھنے یا شکست کرنے، دوسری مخلوقات سے اپنے ربط پر غور کرنے اور سب سے بڑھ کر زندگی میں معنی تلاش کرنے کا سوال ہے، منطقی فکر کے پہلو بہ پہلو اسطوری فکر آج بھی موجود ہے؛ آج دیوی دیوتا اس طرح ایک واقعاتی صداقت کے طور پر 'موجود' نہیں، مگر اپنی علامتی حیثیت میں موجود ہیں۔ جب کوئی شے علامتی حیثیت اختیار کر جاتی ہے تو وہ زیادہ زرخیز ہو جاتی ہے؛ اس میں طرح طرح کی صورتِ حال کی ترجمانی کے زیادہ امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیرن آرمسٹرانگ کو خود اپنے مغالطے کا غیر شعوری احساس ہے، اسی لیے کتاب کے آخری باب کے آخر میں وہ یہ کہے بنا نہیں رہ سکیں کہ جدید عہد میں شاعری اور فکشن نے اساطیر کو 'زندہ' رکھا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ان کا انگریزی ادب کا مطالعہ ان کی مدد کو پہنچتا ہے۔ اگر منطقی فکر کا حقیقی داخلی تضاد اسطوری فکر سے ہوتا تو بیسویں صدی کے بڑے ادب میں (خواہ وہ ٹی ایس ایلیٹ کی 'ویسٹ لینڈ' ہو، جیمس جوائس کا 'یولی سس' ہو، ٹامس مان کے 'میجک موئنٹین' اور 'ہولی سنز' ہوں، ہرمن ہیسے کا 'سدھارتھ' ہو، اور اردو میں راشد کی نظمیں 'سبا ویراں' اور 'حسن کوزہ گر' ہو، انتظار حسین کے افسانے 'آخری آدمی' اور 'نرناری' ہوں، وزیر آغا کی طویل نظم 'اک کتھا انوکھی' ہو) اساطیر کیوں کر ظاہر ہوتیں۔ یہ کافی غور طلب بات ہے کہ جدید عہد کے تخیل نے اسطوری اور منطقی فکر میں داخلی اور جوہری سطح پر تضاد نہیں دیکھا۔ غور کیجیے: ناول اپنی اصل میں حقیقت نگاری پر مبنی ہے، اور ایک سیکولر ہیئت ہے مگر بیسویں صدی کے ناول ہی میں سب سے

www.MashalBooks.org

زیادہ اساطیری عناصر ظاہر ہوئے ہیں؛ نہ صرف پرانی اساطیر کی نئی تعبیر کی گئی ہے، بلکہ نئی اساطیر بھی وضع کی گئی ہیں۔ بایں ہمہ کیرن آرمسٹرانگ کی اس بات سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ ایک ناول کا مطالعہ، ایک اسطورہ کی رسم ادا کرنے کے مترادف ہے کہ دونوں میں آدمی کا یا کلپ کے ایک غیر معمولی تجربے سے گزرتا ہے۔ بلاشبہ ایک بڑے ناول کا مطالعہ آدمی کو بدل دیتا ہے؛ اس کے واقعات، کردار، تھیم، موتف آدمی کے شعور میں مستقل جگہ بنا لیتے اور اسے زندگی کا نیا اور بدلا ہوا فہم دیتے ہیں، مگر اسطورہ کا تجربہ آدمی کو جس ماورائیت سے وابستہ کرتا ہے، اسے ناول میں تلاش نہیں کیا جاسکتا؛ ناول اپنی نہاد میں سیکولر ہے، لہٰذا یہاں جب پرانی اساطیر پیش ہوتیں یا نئی اسطورہ وضع کرنے کی سعی ہوتی ہے، تو مقصد سماجی، نفسیاتی، ثقافتی صورت حال کی ترجمانی یا تعبیر ہوتا ہے۔ اسطورہ کی ماورائیت، سماجیت میں بدل جاتی ہے۔ یہ ایک طرح سے اسطوری فکر کو سیکولر بنانا ہے؛ دونوں میں تضاد ختم کر کے ایک دوسرے کا تکملہ بنانا ہے۔ ٹامس مان اور انتظار حسین نر ناری کی قدیم ہندی اسطورہ کے ذریعے جدید عہد کی الم ناک صورتِ حال کی ان پرتوں کا انکشاف کرتے ہیں جن کے معانی قائم کرنے میں اسطور ہی معاون ہوسکتی ہے۔ اسطورہ کے بارے میں کیرن کہتی ہیں کہ وہ ہر جگہ اور ہر زمانے کی کہانی ہے، یعنی وہ ایک ایسی صداقت کی حامل ہے جو مخصوص جگہ اور وقت سے ماورا ہے، جب کہ ناول کی کہانی کسی خاص جگہ اور خاص وقت میں رونما ہوتی ہے۔ لہٰذا جب ناول میں اسطور پیش ہوتی ہے تو زمانیت اور واقعیت کی تفہیم لازمانیت کی مدد سے کی جاتی ہے۔ یہاں بھی منطقی اور اسطوری فکر ایک دوسرے کی معاون ثابت ہوتی ہیں۔

اسطوری اور منطقی فکر کس طور ایک دوسرے کے مدمقابل آنے کی بجائے، ایک دوسرے کی دست و بازو بنتی ہیں، اس کی مثال خود کیرن آرمسٹرانگ کی یہ کتاب ہے۔ پوری کتاب منطقی فکر یا لوگوس کے تحت لکھی گئی ہے۔ لوگوس میں استدلال، تجربیت، دلائل کا منظّم و مسلسل ہونا، مفروضہ پیش کر کے اسے ثابت کرنے کے لیے معروضی ثبوت لانا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب اس کتاب میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں لوگوس نے میتھوس کو پوری کامیابی سے واضح کیا ہے۔ اگر لوگوس کی زبان میتھوس کے پیغام کا ابلاغ کرسکتی ہے تو دونوں میں تضاد نہیں ہوسکتا۔ جب کہ کیرن آرمسٹرانگ اس خیال کی حامل ہیں کہ دونوں میں ایک دوسرے کی معاونت کی صلاحیت نہیں۔ اس لیے وہ مذہبی متون کی عقلی تفسیر کی حامی نظر نہیں آتیں۔ یہ نقطۂ نظر ہمارے سماج کے بعض گروہوں کو شاید زیادہ

پسند آئے جو مذہب کو 'خالص' رکھنے کی خاطر اسے معاصر سائنسی و سماجی علوم سے 'محفوظ' بنانا چاہتے ہیں۔ مگر ہماری رائے میں سماج ایک طرح سے ماحولیاتی سالمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے ایک منطقے یا مظہر میں تبدیلی پورے ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے؛ اور ماحول کے دیگر عناصر جب تک اس تبدیلی کے مطابق خود کو نہیں ڈھالتے، وہ پورے ماحول سے اجنبی ہو جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ ماحول سے یا تو بیگانۂ محض ہو جاتے ہیں یا باہر ہو جاتے ہیں۔ تاہم واضح رہے کہ 'تبدیلی کے مطابق خود کو ڈھالنے کا مطلب' اپنے بنیادی تصورات کو ترک کرنا نہیں، ان کی ایسی تعبیرِ نو ہے جو معاصر نظامِ معنی سے ہم آہنگ اگر نہ بھی ہو تو اس میں قابلِ فہم ضرور ہو۔

یہ چند معروضات تو کتاب کے نہایت اہم مباحث کی وضاحت میں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اسطور کے معنی، تاریخ اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات کو نہایت عمدہ اسلوب میں واضح کرتی ہے۔ ترجمے میں کتاب کے معانی کی تمام پرتوں کو منتقل کرنا محال تھا۔ اس کا باعث جہاں مترجم کی بے بضاعتی ہے، وہاں خود ترجمے کا فن بھی ہے۔ جس طرح ایک ثقافت کی اسطور کو کسی دوسری ثقافت کی زبان میں نہ تو پیش کیا جاسکتا ہے، نہ اس کی قلبِ ماہیت کی قوت کو غیر زبان میں دریافت کیا جاسکتا ہے۔ میں جس قدر فراخ دل، کشادہ ذہن، روادار اہوں، گرجے میں حضرت عیسیٰؑ کی شبیہ دیکھ کر وہ مذہبی جذبات محسوس نہیں کرسکتا (البتہ تحسین کرسکتا، احترام کے جذبات محسوس کرسکتا ہوں) جو روضہ رسول کی شبیہ دیکھ کر محسوس کرتا ہوں اور جو مجھے ایک اور ہی دنیا میں پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح انگریزی میں لکھی اس کتاب کے مطالب کے بعض پہلو تو ترجمے میں پیش ہوگئے ہیں (اس کا مجھے اطمینان ہے) مگر زبان کا وہ جمال منتقل نہیں ہوسکا جو کیرن آرمسٹرانگ کی انگریزی تحریر میں ہے اور جو اس کتاب کے مطالب ہی کا ایک جز ہے۔

میں جناب مسعود اشعر صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے اس کتاب کے ترجمے کا موقع دیا اور اس ضمن میں مجھ پر اعتماد کیا۔

ناصر عباس نیر
شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

۵ جون ۲۰۱۳

www.MashalBooks.org

اسطور کیا ہے؟

اسطور سازی بنی نوع انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ آثاریات کے ماہروں کو نینڈر تھال [حجری دور کے انسان کا ڈھانچہ] کی قبروں کی کھدائی کے دوران میں ایسے ہتھیار، آلات اور قربانی کے جانوروں کی ہڈیاں ملی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ (نینڈر تھال) اپنی موجودہ زندگی سے ملتی جلتی آئندہ کی زندگی پر اعتقاد رکھتے تھے۔ نینڈر تھال نے ایک دوسرے کو اس زندگی سے متعلق کہانیاں سنائی ہوں گی جو ان کے مرے ہوئے ساتھی بسر کر رہے ہوں گے۔ وہ یقیناً موت سے متعلق ایک ایسے انداز میں سوچتے ہوں گے جو ان کے ساتھ رس بس رہی مخلوقات نے اختیار نہیں کیا۔ جانور ایک دوسرے کو مرے ہوئے دیکھتے ہیں، مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہے، وہ اس پر مزید کوئی توجہ نہیں دیتے، لیکن نینڈر تھال کی قبریں ظاہر کرتی ہیں کہ جب ان ابتدائی انسانوں کو اپنی فنا پذیری کا ادراک ہوا تو انہوں نے اس سے مصالحت کرنے کی غرض سے ایک طرح کا متبادل بیانیہ خلق کر لیا۔ نینڈر تھال جس احتیاط سے اپنے ساتھیوں کو دفن کرتے تھے، اس سے لگتا ہے کہ وہ مرئی دنیا ہی کو واحد حقیقت خیال نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ انسانی تاریخ کے بالکل ابتدائی عہد ہی سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ نوع انسانی کا [دیگر مخلوقات کے مقابلے میں] امتیاز یہ ہے کہ وہ روزمرہ تجربے سے ماورا خیالات قائم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ہم معنی کی جستجو کرنے والی مخلوق ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، کتے، سگانہ صورت حال سے متعلق آزار محسوس نہیں کرتے، نہ دنیا کے دوسرے حصوں میں اپنی نوع کی کسمپرسی سے پریشان ہوئے ہیں اور نہ ہی اپنی زندگیوں کو ایک مختلف تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن انسان

جلد مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم نے بالکل ابتداء ہی میں ایسی کہانیاں گھڑیں جن سے ہم زندگی کو ایک بڑے منظر نامے میں سمجھنے کے قابل ہو سکے۔ یہ کہانیاں [اشیاء مظاہر کی] زیریں تنظیم کو منکشف کرتی تھیں اور ہمیں احساس دلاتی تھیں کہ ہر طرح کی مایوسی اور بکھراؤ کے ہوتے ہوئے زندگی معنی اور قدر و منزلت رکھتی ہے۔

انسانی ذہن کی ایک اور امتیازی خصوصیت، ایسے خیالات اور تجربات کا حامل ہونا ہے جن کی عقلی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔ ہم تخیل کے نام سے ایک ایسی صلاحیت رکھتے ہیں جو ہمیں کسی ایسی چیز کا خیال کرنے کے قابل بناتی ہے جو فی الوقت ہمارے سامنے موجود نہیں ہوتی اور جب ہم اسے پہلی مرتبہ تصور میں لاتے ہیں تو اس کا کوئی معروضی وجود نہیں ہوتا۔ یہ تخیل کی صلاحیت ہی ہے جس نے مذہب اور اساطیر کو پیدا کیا ہے۔ ہمارے زمانے میں اسطوری فکر کی ساکھ باقی نہیں رہی۔ ہم اکثر اسے غیر عقلی اور مبالغہ آمیز سمجھ کر مسترد کر دیتے ہیں۔ لیکن تخیل ہی وہ صلاحیت ہے جس نے سائنس دانوں کو نیا علم منظر عام پر لانے اور نئی ٹیکنالوجی ایجاد کرنے کے قابل بنایا ہے جس نے ہمیں بے حساب طور پر ذی اثر بنایا ہے۔ سائنس دانوں کے تخیل سے ہم اوپر خلاء میں سفر کرنے اور چاند پر چہل قدمی کے قابل بھی ہوئے ہیں اور یہ کارنامے کبھی اساطیری دنیا ہی میں ممکن تھے۔ اساطیر اور سائنس دونوں سے نوع انسانی کا مطمح نظر وسیع ہوا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی مانند اساطیر (جیسا کہ ہم آگے بحث کریں گے) اس دنیا سے خود کو الگ کرنے سے متعلق نہیں بلکہ اس کے اندر زیادہ ذی الحس ہو کر جینے کے قابل بنانے سے متعلق ہے۔

نینڈر تھال کی قبروں سے اسطور کے بارے میں پانچ اہم باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اول اسطور کی بنیاد تقریبا ہمیشہ موت کے تجربے اور فنا کے خوف پر ہوئی ہے۔ دوم، جانوروں کی ہڈیاں ظاہر کرتی ہیں کہ قربانی سمیت تدفین ہوا کرتی تھی۔ رسوم کو اساطیر سے بالعموم الگ نہیں کیا جاتا۔ بہت سی اساطیر کا اس اجتماعی عبادتی تمثیل سے ہٹ کر کوئی مفہوم نہیں ہوتا جو انہیں زندہ کر دیتی ہے، نیز یہ اساطیر غیر مذہبی فضا میں ناقابل فہم ہوتی ہیں۔ سوم، نینڈر تھال کی اسطور ایک طرح سے قبر جو زندگی کی انتہاء ہے، کے پہلو میں دہرائی جاتی تھی۔ انتہائی پر اثر اساطیر حد انتہاء سے متعلق ہیں، یعنی وہ ہمیں اپنے تجربے کو عبور کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ہماری زندگی میں بعض مواقع ایسے آتے ہیں جب ہمیں ایک طرح سے یا دوسری طرح سے، کسی ایسی جگہ پر جانا پڑتا ہے جسے پہلے کبھی نہیں

www.MashalBooks.org

دیکھا ہوتا اور وہ کچھ کرنا پڑتا ہے جو پہلے کبھی نہیں کیا ہوتا۔ اسطور نا معلوم سے متعلق ہے، یہ اس شے کے بارے میں ہے جسے ہم ابتداً لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسطور کی تھاہ ایک غیر معمولی سکوت ہے۔ چہارم، اسطور، کہانی برائے کہانی نہیں ہے۔ یہ ہمیں زندگی کرنے کا ڈھنگ سکھاتی ہے، نینڈرتھال کی قبروں میں میت کو بعض اوقات جنینی حالت میں رکھا گیا ہے تا کہ دوسرا جنم لے سکے، تاہم مرحوم کو اگلا قدم تو خود ہی اٹھانا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اساطیر ہمیں اس یا آئندہ دنیا میں درست عمل کرنے کی غرض سے صحیح روحانی یا نفسیاتی بہاؤ میں لے جاتی ہیں۔

نینڈرتھال کی قبریں اسطور سے متعلق ہمیں پانچویں اور اہم بات یہ بتاتی ہے کہ تمام اساطیر ایک دوسرے منطقے کی خبر دیتی ہیں مگر جو ہماری یعنی دنیا سے ملحق ہے اور ایک طرح سے اسے سہارا دیئے ہوئے ہے۔ وہ غیر مرئی مگر پر اثر حقیقت جسے بعض اوقات دیوتاؤں کی دنیا کہا جاتا ہے، اساطیر کا مرکزی موضوع ہے۔ اسے ''دائمی فلسفہ'' کہا گیا ہے، کیوں کہ اس میں ہماری سائنسی جدیدیت کے آغاز سے پہلے کے تمام معاشروں کی دیو مالا، رسوم اور معاشرتی تنظیم جاگزیں ہیں اور آج بھی بیشتر روایتی معاشرے اس سے اثر قبول کیے چلے جا رہے ہیں۔ اس ''دائمی فلسفے'' کے مطابق جو کچھ ہماری دنیا میں واقع ہوتا ہے، جو ہم سنتے اور دیکھتے ہیں، اس کی زیریں سطح پر اس کا مثیل الوہی مملکت میں موجود ہوتا ہے، جو ہماری دنیا سے زیادہ دلفریب، زبردست اور دیرپا ہے۔ [۱] لہٰذا ہر مادی حقیقت اس آرکی ٹائپ کا دھندلا سایہ ہے، یعنی ایک اصلی مثالی نمونے کی ناقص نقل ہے۔ اس الوہی زندگی میں شامل ہو کر ہی فانی، بودے انسان اپنے خوابیدہ جوہر [سے آگاہ اور اس] کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اساطیر نے اسی حقیقت کو ایک قطعی شکل اور ہیئت دی ہے، جسے لوگوں نے وہبی طور پر محسوس کیا، اساطیر نے لوگوں کو سمجھایا کہ دیوتاؤں کا رنگ ڈھنگ کیا ہے، تاہم واضح رہے کہ یہ نہ تو بے کار تجسس کی پیداوار ہیں نہ یہ تفریحی کہانیاں ہیں، بلکہ یہ مردوں اور عورتوں کو ان طاقتور ہستیوں کے نقش قدم پر چلنا اور الوہیت کا خود تجربہ کرنا سکھاتی ہیں۔

ہم اپنی سائنسی ثقافت کے زیر اثر الوہی ہستی کے عموماً بڑے سادہ لوح تصورات رکھتے ہیں۔ قدیم دنیا میں ''دیوتاؤں'' کو شاید ہی ایسی مافوق الفطرت ہستیاں سمجھا گیا ہو جو متمیز شخصیتیں رکھتے ہوں اور یک سر الگ تھگ مابعد الطبیعاتی زندگی بسر کرتے ہوں۔ اساطیریات جدید مفہوم میں دینیات کے متعلق نہیں تھی، بلکہ انسانی تجربے سے متعلق تھی، لوگ سوچتے تھے کہ دیوتا، انسان،

جانور فطرت اٹوٹ بندھن میں بندھے تھے، یکساں قوانین کے پابند تھے اور ان کا خمیر یکساں الوہی جوہر سے اٹھا تھا، ابتداء میں دیوتاؤں کی دنیا اور مردوں، عورتوں کی دنیا میں وجود پاتی خلیج نہیں تھی۔ جب لوگ الوہی ہستی کے بارے میں بات چیت کرتے تھے تو وہ عموماً دنیاوی حقیقت ہی کے ایک پہلو کو معرض گفتگو میں لا رہے ہوتے تھے۔ دیوتاؤں کے وجود کو طوفان، سمندر، دریا یا محبت، غصے، جنس کے ان طاقتور انسانی جذبات سے جدا کرنا ممکن نہیں تھا جو مردوں اور عورتوں کو وقتی طور پر ایک مختلف قلمرو میں پہنچا دیتے تھے تا کہ وہ دنیا کو نئی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

ان معروضات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اساطیر اس لئے وضع کی گئیں کہ وہ غیر یقینی انسانی صورت حال سے نپٹنے میں ہماری مدد کریں۔ اساطیر نے دنیا میں .... دریافت کرنے اور اپنی حقیقی منزل متعین کرنے میں لوگوں کی مدد کی۔ ہم سب جاننا چاہتے ہیں کہ ہم کہاں سے آئے، مگر چونکہ ہماری انتہائی شروعات قبل تاریخ کی دھند میں گم ہو چکی ہیں، اس لئے ہم نے اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں دیو مالائیں تخلیق کیں جو ہر چند تاریخی نہیں ہیں پر وہ اپنے ماحول، ہمسایوں اور رواجوں سے متعلق ہمارے موجودہ رویوں کو سمجھنے میں ہماری دست گیری کرتی ہیں۔ ہم یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، اسی لیے ہم نے ایسی کہانیاں گھڑی ہیں جو ہماری بعد از مرگ زندگی کے بارے میں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ (جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے) ایسی اساطیر کی تعداد زیادہ نہیں جو بنی نوع انسان کی لافانیت کا تصور پیش کرتی ہوں۔ نیز ہم ان ارتقاعی لمحات کی توجیہ کرنا بھی چاہتے ہیں، جب ہمیں لگتا ہے کہ ہم اپنے روزمرہ جھمیلوں سے ماورا ہوئے جا رہے ہیں۔ دیوتاؤں نے ماورائیت کے تجربے کی توجیہہ کرنے میں ہمیں مدد دی ہے۔ یہ دائمی فلسفہ ہماری اس باطنی حس کا اظہار کرتا ہے کہ جو کچھ دکھائی دیتا ہے، اس سے سوا اور پرے، بنی نوع انسان اور مادی دنیا کے لئے بہت کچھ موجود ہے۔

آج کل لفظ ''اسطورہ'' سے عام طور پر ایک ایسی چیز مراد لیا جاتا ہے جو مطلق سچ نہ ہو۔ کوئی سیاست دان، جس پر معمولی خطا کا الزام ہو، کہے گا کہ یہ ایک 'اسطورہ' (متھ) ہے، ایسا کچھ کبھی واقع نہیں ہوا۔ جب ہم سنتے ہیں کہ دیوتا زمین پر چل رہے ہیں، مردے مقبروں سے باہر آ کر ڈگ بھر رہے ہیں یا سمندر معجزانہ طور پر پھاڑے جا رہے ہیں تا کہ محبوب لوگوں کو دشمنوں سے بچایا جا سکے تو ہم ان کہانیوں کو نا قابل یقین اور صریحاً غیر حقیقی قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں۔ ہم نے

www.MashalBooks.org

اٹھارویں صدی سے سائنسی زاویہ نظر پیدا کر لیا ہے۔ لہٰذا ہمارا سروکار سب سے بڑھ کر اس بات سے ہے کہ واقعتاً کیا رونما ہوا۔ لیکن قبل جدید دنیا میں جب لوگ ماضی کے بارے میں خاصہ فرسائی کرتے تھے تو ان کا سروکار اس بات سے ہوتا تھا کہ ایک واقعے کا معنی و مفہوم کیا تھا۔ ایک اسطورہ ایک واقعہ تھی جو ایک لحاظ سے، ایک ہی مرتبہ پیش آیا مگر جو ہمیشہ بھی پیش آتا رہا۔ چوں کہ ہم تاریخ کا واقعاتی ترتیب سے ہٹ کر کوئی تصور ہی نہیں کر سکتے، اس لیے مذکورہ اساطیری واقعے کے لئے ہمارے پاس کوئی لفظ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اساطیر آرٹ کی ایک قسم ہے، جو ہمیں انسانی وجود کے اس لازمانی عنصر کی طرف متوجہ کرتی ہے جو تاریخ سے ماورا ہے، اس کی مدد سے ہم بے ترتیب واقعات کے غیر منظّم سیلان سے اوپر اٹھ کر حقیقت کے مرکزے کی جھلک پا سکتے ہیں۔

ماورائیت کا تجربہ، انسانی تجربے کا ہمیشہ حصہ رہا ہے۔ جب کوئی شے ہمارے دل کے تار چھو لیتی ہے اور ہم لمحاتی طور پر خود کو اپنے آپ سے بلند ہوتا محسوس کرتے ہیں تو یہ ہمارے لئے وجد و سرمستی کی حالت ہوتی ہے۔ ایسے لمحات میں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم معمول سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ جی رہے ہیں، اپنے جملہ امکانات کو بروئے کار لا رہے ہیں اور ہم اس منطقے میں سانس لینے لگے ہیں جو ہماری کل انسانیت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مذہب، وجود حاصل کرنے کیلئے اکثر روایتی ذرائع میں سے ایک رہا ہے، لیکن اگر لوگوں کو اب یہ مندروں، کنیسوں، گرجوں، یا مسجدوں میں نہیں ملتا تو وہ اسے کہیں اور تلاش کرتے ہیں، مثلاً آرٹ، موسیقی، شاعری، عوامی گیتوں، رقص، منشیات، جنس یا کھیلوں میں، شاعری اور موسیقی کی مانند، اساطیر کو ہمارے اندر ایک عالم کیف بیدار کرنا چاہیے، اس حقیقت کے باوصف کہ موت ناگزیر ہے اور اپنے نیست و نابود ہونے کے آثار دیکھتے ہی ہم پر حرماں کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اگر ایک اسطورہ یہ سب نہیں کر سکتی تو سمجھ لیجئے کہ اس پر مُردنی چھا چکی اور اپنی افادیت کھو چکی ہے۔

بنا بریں اسطور کو ایک ادنیٰ طرز فکر سمجھنا ایک غلطی ہے، جسے اس بنا پر ترک کر دیا جائے کہ نوع انسانی عقل کے عہد میں داخل ہو چکی ہے۔ اساطیر ان ابتدائی کوششوں میں شامل نہیں جو تاریخ کے سلسلے میں کی گئیں اور نہ ہی انہیں یہ غرہ ہے کہ ان کی کہانیاں معروضی حقیقت ہیں۔ ناول، غنائی تمثیل یا سنگیت ناچ کی طرح، اسطور واہمے پر مبنی ہے۔ یہ ایک ایسا کھیل ہے، جو ہماری پارہ پارہ المیہ دنیا کو ارفع و مثالی صورت دیتا ہے اور یہ سوال اٹھا کر نئے امکانات کی جھلک پانے میں

ہماری مدد کرتا ہے کہ ''اگر ایسا ہوا تو کیا فرق پڑے گا؟'' ......ظاہر ہے یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے نتیجے میں فلسفے، سائنس اور ٹیکنالوجی میں بعض انتہائی اہم دریافتیں سامنے آتی ہیں۔ نینڈرتھال اپنے مردہ ساتھیوں کو ایک نئی زندگی کیلئے تیار کرتے ہوئے، غالباً روحانی واہمے کے اسی کھیل میں مشغول ہوئے تھے جو تمام اسطور سازوں میں مشترک ہے: ''اگر یہ دنیا اسی طرح وہاں نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟ یہ بات کس طور ہمیں نفسیاتی، عملی یا سماجی اعتبار سے متاثر کرے گی؟ کیا ہم مختلف [وجود] بن جائیں گے؟ زیادہ مکمل؟ اور اگر ہمیں یہ پتہ چلے کہ ہماری قلب ماہیت ہوگئی تو کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوگا کہ ہمارا اسطوری اعتقاد ایک لحاظ سے سچا تھا جو ہمیں ہماری انسانیت سے متعلق کوئی اہم نکتہ سمجھا رہا تھا، خواہ ہم اسے عقلی طور پر ثابت نہ کر سکیں؟'' نوع انسانی کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس نے کھیل و ناٹک کی صلاحیت برقرار رکھی ہے۔[۲] دوسرے جانور جنگل کی زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرتے ہی کھیل و تفریح کے ابتدائی احساس سے محروم ہو جاتے ہیں، سوائے اس کے کہ وہ قید کے مصنوعی حالات میں جی رہے ہوں۔ تاہم بالغ انسان مختلف امکانات کے ساتھ شوخی و دل لگی کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اور ہم سب بچوں کی طرح تخیلاتی دنیاؤں کی تخلیق کرتے رہے ہیں۔ آرٹ میں ہم عقل و منطق کی بندشوں سے آزاد ہو کر، نئی ہیئتوں کو تصور اور متحد کرتے ہیں، جن سے ہماری زندگیوں میں بہتری آئی ہے اور جن کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ وہ ہمیں کچھ اہم اور بدرجہ غایت سچی باتوں کی تعلیم دیتی ہیں۔ اساطیر میں بھی ہم ایک مفروضہ زیر غور لاتے ہیں، رسوم کے ذریعے اسے زندگی کے قریب لاتے ہیں، اس پر عمل کرتے ہیں، اپنی زندگیوں پر اس کے اثرات دھیان میں لاتے ہیں اور اس سب کے نتیجے میں ہم پر منکشف ہوتا ہے کہ اپنی دنیا کے پریشان کن معمے کے لئے ہم نے ایک نئی بصیرت حاصل کر لی ہے۔

لہٰذا ایک اسطور اس بنا پر سچی ہے کہ یہ موثر ہے نہ کہ اس بنا پر کہ یہ ہمیں واقعاتی معلومات دیتی ہے۔ تاہم اگر یہ زندگی کے گہرے معنی کے سلسلے میں ہمیں نئی بصیرت عطا کرنے سے قاصر رہتی ہے تو اس کی ناکامی یقینی ہے۔ اگر یہ اثر کرتی ہے، یعنی یہ ہمارے ذہنوں اور دلوں کو بدلنے کی تحریک دیتی ہے، ہمیں نئی امیدیں دیتی ہے اور ہمیں مزید بھرپور طریقے سے زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتی ہے تو یہ ایک معقول اسطورہ ہے۔ اساطیر صرف اسی وقت ہمیں ایک ارفع تبدیلی سے ہمکنار کریں گے جب ہم ان کی ہدایات کی پیروی کریں گے۔ ایک اسطورہ اپنی اصل میں ایک رہبر ہے۔ یہ ہمیں سکھاتی

www.MashalBooks.org

ہے کہ زیادہ بہتر زندگی بسر کرنے کیلئے ہمیں بالضرور کیا کرنا چاہیے۔ اگر ہم اسطور کا اطلاق خود اپنی صورت حال پر نہیں کرتے اور اسے اپنی زندگیوں کی ایک حقیقت نہیں بناتے تو یہ اسی طرح نا قابل فہم اور بعید رہے گی جس طرح تختے پر کھیلے جانے والے کے اصول ہمیں تب تک پریشان اور بے زار کرنے والے لگتے ہیں جب تک ہم [سمجھ کر] کھیلنا شروع نہیں کرتے۔

اسطور سے ہماری موجودہ بیگانگت بے مثال ہے۔ قبل جدید دنیا میں اساطیر ناگزیر تھی۔ انہوں نے نہ صرف لوگوں کو اپنی زندگیوں کا مفہوم سمجھنے میں مدد دی، بلکہ انسانی ذہن کے ان علاقوں کو بھی منکشف کیا جو دوسری صورت میں نا قابل رسائی تھے۔ اسطور، نفسیات کی ابتدائی صورت تھی۔ دیوتاؤں اور سورماؤں کی کہانیاں جو تاریک دنیا میں واقع ہوتی، بھول بھلیوں میں راستہ بناتی، راکشسوں سے نبرد آزما ہوتی ہیں، سائیکی کی پراسرار کارکرگی منظر عام پر لاتی ہیں اور لوگوں پر یہ بات افشا کرتی ہیں کہ وہ اپنے داخلی بحرانوں کا کیوں کر سامنا کریں۔ جب فرائیڈ اور ژونگ نے جدید انسان کی روح کی جستجو کا خاکہ کھینچنا شروع کیا تو وہ اپنی بصیرتوں کی توجیہہ کے لئے کلاسیکی اساطیر کی طرف جبلی طور پر متوجہ ہوئے اور پرانی دیو مالاؤں کی ایک نئی تعبیر پیش کی۔

اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہ تھی۔ اسطور کا کوئی واحد، کٹر روایتی متن کبھی موجود نہیں رہا۔ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ہی ہمیں اپنی کہانیوں کو مختلف انداز میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، تاکہ ہم ان کی لازمی سچائی کو سامنے لاسکیں۔ اساطیر کی اس مختصر تاریخ میں ہم اس امر کا جائزہ لیں گے کہ کس طرح ہر مرتبہ مردوں اور عورتوں نے جرات مندانہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنی اساطیر پر نظر ثانی کی اور انہیں نئی صورت حال کے مطابق ڈھالا۔ علاوہ بریں ہم یہ بھی جانیں گے کہ انسانی فطرت کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہوتی اور ان میں سے بہت سی اساطیر آج بھی ہمارے بنیادی اندیشوں اور آرزوؤں کو موضوع بناتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ ان معاشروں میں وضع ہوئیں جو ہمارے معاشروں سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔

☆☆☆

www.MashalBooks.org

آغاز حجری دور: شکاری قبائل کی اساطیر
(۲۰۰۰۰ تا ۸۰۰۰ ق م)

نوع انسانی .... میں وہ عہد طویل ترین اور سب سے زیادہ تشکیلی تھا جب اس نے اپنا حیاتیاتی ارتقاء مکمل کیا۔ یہ زمانہ کئی اعتبار سے خوفناک اور گمبھیر تھا۔ ابتدائی عہد کے ان انسانوں نے ابھی کاشت کاری نہیں سیکھی تھی۔ وہ اپنی خوراک خود نہیں اگا سکتے تھے، اس لئے ان کا سارا انحصار شکار کرنے اور ذخیرہ کرنے پر تھا۔ ان کی بقاء کیلئے اساطیر اتنی ہی ضروری تھیں جتنے ان کے شکار کے ہتھیار اور حسن تدبیر ضروری تھے جنہیں اپنے شکار کو مارنے اور اپنے ماحول پر ایک حد تک قابو پانے کیلئے، انہوں نے ترقی دی تھی۔ نینڈر تھال کی مانند ہی، حجری عہد کے مرد اور عورتیں اپنی اساطیر کو تحریری صورت میں محفوظ نہ کر سکے مگر یہ کہانیاں نوع انسانی کے خود کو اور اپنی صورت حال کو سمجھنے میں کسی حد درجہ اہم ثابت ہوئیں، اس کا اندازہ ہم اس سے لگا سکتے ہیں کہ یہ خواندہ ثقافتوں کی دیو مالاؤں میں شکستہ حالت میں باقی رہ گئی ہیں۔ ہم عہد عتیق کے ان انسانوں کے تجربات اور مشاغل کے بارے میں افریقہ کے استوائی، علاقوں کے یا جنوب مشرقی ایشیاء کے پستہ قد لوگوں یا آسٹریلوی آدی باسیوں سے بھی کافی کچھ جان سکتے ہیں، جو آغاز حجری دور کے لوگوں کی طرح شکاری گروہوں کی صورت رہتے ہیں اور زرعی انقلاب کے عہد میں داخل نہیں ہوئے۔

ان مقامی دیسی باشندوں کیلئے اسطور اور علامت مین سوچنا فطری ہے، کیوں کہ نسلیات اور بشریات کے ماہروں کے بقول، یہ لوگ اپنی روزمرہ زندگیوں کی ایک روحانی جہت کا گہرا شعور

رکھتے ہیں۔ جس تجربے کو ہم مقدس یا الوہی کہتے ہیں، وہ صنعتی، شہری سماج کے مردوں عورتوں کے لئے ایک بعید حقیقت بن چکا ہے، مگر آسٹریلوی مقامی باشندوں کے لئے یہ نہ صرف ایک بین حقیقت ہے بلکہ مادی دنیا کے مقابلے میں زیادہ حقیقی بھی ہے۔ پرکھوں کا سنہری زمانہ (Dreamtime)، جس کا تجربہ آسٹریلوی نیند یا کشف کی حالت میں کرتے ہیں، لا زمانی اور 'ہر لمحے کا' ہے۔ یہ معمول کی زندگی کا مستحکم پس منظری پردہ ہے، جس پر موت، تغیر، واقعات کے لا متناہی تسلسل اور موسموں کے چکر کا سب سے نمایاں اثر ہوتا ہے۔ 'پرکھوں کا سنہری زمانہ، عبارت' ہے ان آباؤ اجداد سے جن کا تصور طاقتور، آرکی ٹائپل ہستیوں کے طور پر کیا جاتا ہے، انہی سے انسانوں نے شکار، جنگ، جنس، پارچہ بانی اور ٹوکری سازی جیسے فنون سیکھے جو ان کے جینے کیلئے ناگزیر ہیں۔ لہٰذا یہ سرگرمیاں دینوی اور حقیر نہیں، مقدس ہیں جو فانی مردوں اور عورتوں کو پرکھوں کے سنہری زمانے، سے وابستہ رکھتی ہیں۔ مثلاً جب ایک آسٹریلوی شکار کرنے جاتا ہے تو وہ اولین شکاری کے طرز عمل کو بطور مثالی نمونہ سامنے رکھتا ہے، اس سے یکجائی محسوس کرتا ہے اور یوں انتہائی پر اثر آرکی ٹائپل دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں معنی صرف اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب وہ پرکھوں کے سرّی زمانے سے بسری وحدت کا تجربہ کرتا ہے۔ بعد ازاں قدیمی بھید رخصت ہو جاتا ہے اور وہ زماں کی دنیا میں لوٹ آتا ہے، وہ ڈرتا ہے کہ یہ دنیا اسے نگل لے گی اور وہ کچھ کرتا ہے اسے معدوم ہونے پر مجبور کر ڈالے گی۔ [۳]

روحانی دنیا ایک ایسی وہبی اور توجہ خیز حقیقت ہوتی ہے کہ [آسٹریلوی] دیسی باشندے اس بات کو معقول سمجھتے ہیں کہ ایک بار نوع انسانی کی اس تک رسائی ضرور ہو۔ ہر ثقافت میں ہمیں جنت گم گشتہ کی اسطورہ ملتی ہے، جس کے مطابق انسانوں کا الوہی ہستی سے گہرا اور ہر وقت رابطہ رہتا تھا، وہ لافانی تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ، جانوروں اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کی زندگی گزارتے تھے۔ اس دنیا کے مرکز میں ایک درخت، پہاڑ یا بلی ہوا کرتی تھی جو زمین اور آسمان کو ملاتی تھی اور جس پر آسانی سے چڑھ کر لوگ دیوتاؤں کی قلمرو میں پہنچ جاتے تھے۔ پھر ایک ناگہانی آفت آئی: پہاڑ منہدم ہو گیا، درخت کاٹ ڈالا گیا اور آسمان تک رسائی محال ہو گئی۔ عہد زریں کی کہانی کو، جو انتہائی ابتدائی اور تقریباً آفاقی اسطورہ ہے، کبھی تاریخی تصور نہیں کیا گیا۔ اس کہانی کا سرچشمہ الوہیت کا وہ تجربہ ہے جو انسانوں کیلئے فطری ہے اور ان کے اس فہم حقیقت کو

www.MashalBooks.org

ظاہر کرتا ہے جس میں امید و بیم ساتھ ساتھ ہیں، نیز یہ حقیقت قابل محسوس بھی ہے اور پہنچ سے دور بھی۔ عہد عتیق کے اکثر مذاہب اور اساطیر میں جنت گم گشتہ کی تڑپ سرایت کیے ہوئے ہے۔[۴] تاہم اسطور محض عارضہ یا دِ ایام گذشتہ (ناسٹلجیا) نہیں تھی۔ اس کا بنیادی مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ لوگ اس آرکی ٹاپئل دنیا کی طرف کیسے لوٹ سکتے ہیں، نہ صرف عالم کشف کی سرمستی کے لمحات ہیں بلکہ اپنی روزمرہ زندگی کے معمول کے فرائض ادا کرنے کے دوران بھی!

اب ہم مذہب کو دنیا سے علیحدہ سمجھتے ہیں۔ یہ بات آغاز حجری دور کے شکاری لوگوں کیلئے ناقابل فہم تھی۔ کیوں کہ ان کے لئے کوئی شے غیر مذہبی اور الحادی نہیں تھی۔ وہ جو کچھ بھی دیکھتے یا تجربہ کرتے تھے، الوہی دنیا میں اس کا مثنیٰ انہیں واضح طور پر نظر آتا تھا۔ کوئی شے خواہ کتنی ہی پست ہو، وہ الوہیت کی تمثیل بن سکتی تھی۔[۵] وہ لوگ جو کچھ بھی کرتے تھے، وہ باطنی و سری علامت تھی جو انہیں دیوتاؤں سے وابستہ رکھتی تھی۔ ان کے انتہائی معمولی اعمال بھی ایسی رسومات ہوا کرتے تھے جو ان فانی انسانوں کو ''ہر لمحہ'' کی لازمانی دنیا میں شریک رہنے کے قابل بناتے تھے۔ ہم جدید لوگوں کیلئے علامت لازمی طور پر اس نادیدہ حقیقت سے جدا ہے جس کی طرف یہ ہمیں متوجہ کرتی ہے، مگر یونانی لفظ Symballein کا مطلب 'اکٹھے پھینکنا' ہے، جس میں دو مختلف اشیاء یکجا ہو جاتی ہیں، جیسے کاک ٹیل میں جو کی شراب اور کسی مقوی مشروب کو ملایا جاتا ہے۔ جب تم کسی دینوی شے پر مائل کر رہے ہوتے تھے تو اس کے الوہی مثنیٰ کی موجودگی کو محسوس کر رہے ہوتے تھے۔ الوہیت میں شرکت کا یہ احساس، اساطیر تصور کائنات کے لئے لازم تھا۔ دوسری لفظوں میں اسطورہ کا مقصد لوگوں کو اس روحانی جہت کا شدت سے احساس دلانا تھا جو ہر طرف سے انہیں گھیرے ہوئے تھی اور زندگی کا فطری حصہ تھی۔

ابتدائی اساطیر نے لوگوں کو تعلیم دی کہ وہ محسوس دنیا کے واسطے سے اس دنیا کو دیکھیں جو ''کسی اور شے'' کی تجسیم کرتی محسوس ہوتی تھی۔[۶] مگر اس کیلئے عقیدے کی طرف جست بھرنے کی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ [تہذیب کے] اس مرحلے پر الوہیت اور دینویت میں مابعد الطبیعیاتی خلیج محسوس نہیں ہوتی تھی، ابتدائی عہد کے یہ انسان جب کسی پتھر پر نظر کرتے تھے تو اسے ایک جامد، غیر امید افزا چٹان کے طور پر نہیں دیکھتے تھے۔ یہ پتھر قوت، استقامت، استواری اور وجود کا ایک مطلق طور ہے جو ہر دم خطرے سے دوچار انسانی حالت سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے

قطعی مختلف ہونے ہی نے اسے مقدس بنایا۔ قدیم دنیا میں پتھر عام قابل پرستش مقدس مظہر تھا جو الوہی باتوں کا کشف کرتا تھا۔ نیز ایک درخت جو بے تکان اپنی تجدید کی قوت رکھتا ہے، زندہ تصور کیا جاتا اور اسے ایک ایسی معجزانہ قوت حیات کا حامل تصور کیا جاتا جس سے فانی مرد و زن محروم ہیں۔ جب لوگ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کا مشاہدہ کرتے تو وہ اس میں افزائش نو کی ایک اور روحانی مثال پاتے[۷] یعنی ایک ایسی اصول کی شہادت پاتے جو بیک وقت سنگین اور ترس آگیں اور دل دہلا دینے والا اور دل کو تسلی دینے والا تھا۔ درختوں، پتھر اور اجرام فلکی کی بجائے خود پرستش نہیں کی جاتی تھی بلکہ وہ اس لیے تقدس مآب ہے کہ وہ الوہیت کی مخفی قوت کے ظہور کی علامت تھے، جسے تمام فطری مظاہر میں پُر جوش طریقے سے کارفرما دیکھا جا سکتا تھا اور جو لوگوں کو ایک دوسری اور قوی حقیقت کو خبر دیتی تھی۔

بالکل ابتدائی اساطیر جن کا زمانہ غالباً حجری دور ہے، ان میں سے کچھ آسمان سے متعلق ہیں۔ لگتا ہے کہ انہوں ہی نے لوگوں کو الوہیت کا ابتدائی تصور دیا۔ جب لوگ آسمان کو تکتے تھے، جو بے کراں، بعید اور ان کی ادنیٰ زندگیوں سے یکسر علیحدہ وجود رکھتا تھا، تو مذہبی تجربے سے گزرتے تھے۔[۸] آسمان ان سے اوپر ایستادہ تھا، ناقابل تصور حد تک بسیط تھا، ان کی رسائی سے باہر اور ابدی تھا۔ یہی ماورائیت اور وجود دیگر کی اصل ہے۔ بنی نوع انسان اسے متاثر کرنے سے قاصر تھے۔ اس کے گرد و باراں، گرہنوں، طوفانوں، طلوع و غروب آفتاب، مقدس قزح اور شہابیوں کا لامتناہی تماشا، ایک دوسری سدا فعال رہنے والی جہت کی خبر دیتا تھا، جس کی ایک اپنی رواں دواں زندگی تھی۔ آسمان کو نگاہ بھر کر دیکھنے سے لوگوں کے دل خوف اور حسرت، ہیبت اور سہم سے بھر جاتے تھے۔ آسمان میں ان کے لئے کشش بھی تھی اور گریز بھی۔ جیسا کہ مذہب کے عظیم مورخ رڈلف اوٹو نے واضح کیا ہے، یہ سب آسمان کی پرجلال دیوتائی ماہیت کے سبب تھا۔ آسمان بجائے خود زبردست، پراسرار اور انتہائی جادو اثر تھا، جس کے عقب میں کوئی تخیلی دیوتا نہیں تھا۔[۹]

یہ ہمیں اساطیری اور مذہبی شعور دونوں کے ایک بنیادی عنصر سے متعارف کراتی ہے۔ ہمارے عہد تشکیک میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ لوگ اس لئے مذہبی ہیں کہ وہ جن دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں ان سے کچھ طلب کرتے ہیں۔ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ''عظیم الوہی طاقتیں'' ان کی طرف داری کریں۔ وہ لمبی عمر، بیماری سے آزادی اور لافانیت چاہتے ہیں اور خیال کرتے ہیں

www.MashalBooks.org

کہ دیوتاؤں کو ان نعمتوں کے حصول کیلئے قائل کیا جا سکتا ہے۔لیکن درحقیقت یہ انتہائی شروع کی کاہنیت ظاہر کرتی ہے کہ عبادت کا لازمی طور پر خود پرستانہ مقصد نہیں تھا۔لوگ آسماں سے کچھ نہیں چاہتے تھے اور خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اسے کسی بھی طرح سے متاثر نہیں کر سکتے۔بالکل ابتدائی زمانوں سے ہم نے دنیا کا تجربہ حد درجہ پراسراریت کے ساتھ کیا ہے۔اس نے ہم پہ ہیبت اور حیرت طاری کی ہے جو عبادت کا جوہر ہیں۔بعض ازاں اسرائیل کے لوگوں نے مقدس ہستی کے لئے قدوس کا لفظ استعمال کیا۔یہ جداگانہ، دیگر تھا۔خالص ماورائیت کا تجربہ بجائے خود گہرے طور پر اطمینان بخش تھا۔یہ لوگوں کو خود سے قطعی ماورا ہستی سے آگاہ کر کے ایک وجد آفریں تجربے سے ہمکنار کرتا تھا اور انہیں محدود حالات سے جذباتی اور تخیلی طور پر بلند کرتا تھا۔اس بات کا قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ آسمان کو غریب، کمزور انسانوں کی مرضی پوری کرنے کیلئے قائل کیا جا سکتا ہے۔

آغاز حجری دور کے خاتمے کے بعد ایک لمبے عرصے تک آسمان کو تقدس کی علامت سمجھا جاتا رہا۔لیکن ایک بالکل ابتدائی تبدیلی نے واضح کر دیا کہ اگر اساطیر حد درجہ ماورائی حقیقت سے متعلق رہے گی تو ناکام ہوگی۔اگر کوئی اسطورہ لوگوں کو مقدس مظاہر میں کسی طرح شریک ہونے کے قابل نہیں بناتی تو وہ ان کے شعور سے بعید اور محو ہو جاتی ہے۔دنیا کے مختلف، دور دراز حصوں کے لوگوں نے کسی وقت (ہم ٹھیک ٹھیک اس کا تعین نہیں کر سکتے) آسمانوں کو مجسم کرنا شروع کیا۔انہوں نے 'سماوی خدا' یا 'خدائے عظیم' کے بارے میں کہانیاں کہنا شروع کیں جو اکیلے ارض و سماء کو عدم سے وجود میں لایا۔یہ قدیم ازمنہ اولیٰ کی وحدانیت یقینی طور پر حجری دور سے تعلق رکھتی ہے۔دنیا کے بہت سے حصوں کے لوگوں نے کثیر دیوتاؤں کی عبادت شروع کرنے سے پہلے واحد خدائے عظیم کا اقرار کیا جس نے دنیا تخلیق کی اور جو دور سے انسانی معاملات کی نگرانی کرتا تھا۔

تقریباً ہر قوم میں اس کا سماوی خدا تھا، بشریات کے ماہرین کو افریقہ کے استوائی خطوں کے بونوں (Pygmies)، آسٹریلیوں اور فیوجین (Feugians) کے یہاں سماوی خدا کا علم ہوا ہے۔[۱۰] وہ تمام اشیاء کی علت اولیٰ اور ارض و سماء کا حاکم ہے۔اس کی کبھی تصویر نہیں بنائی گئی، نہ اس کا کوئی کلیسا ہے نہ پروہت، کیوں کہ وہ انسان پرستی سے کہیں بلند و برتر ہے۔لوگ عبادت میں اپنے خدائے عظیم کے دردمندی سے مشتاق ہوتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ وہ انہیں دیکھ رہا ہے اور غلط کاریوں کی سزا دے گا۔بایں ہمہ وہ ان کی روزمرہ زندگیوں سے غائب ہوتا ہے۔قبائلی لوگوں کا

کہنا ہے کہ وہ ناقابل اظہار ہے اور انسانوں کی دنیا سے روابط نہیں رکھ سکتا۔وہ بحران میں اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، وگرنہ وہ غائب ہے اور اس کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ "دور جا چکا' یا 'اوجھل' ہو چکا ہے۔

قدیم میسوپوٹیمیائی، ویدک ہندوؤں، یونانیوں اور کنعانیوں کے سماوی خدا اس طرح بتدریج سکڑتے چلے گئے۔ان تمام لوگوں کی اساطیر میں خدائے عظیم زیادہ سے زیادہ ایک سایہ نما، بے اختیار ہستی ہے جو ان کے الوہی معبد کے حاشیے پر ہے اور اندر، انلل اور بعل جیسے فعال، دلچسپ اور قابل رسائی دیوتا بڑھ چڑھ کر [ان کی زندگی میں] حصہ لینے لگے ہیں۔ایسی کہانیاں موجود ہیں۔جو بتاتی ہیں کہ خدائے عظیم کیسے معزول ہوا: مثلاً یونانیوں کے سماوی خدا یورانوس کو اصلاً اس کے بیٹے کرونوس نے آختہ کیا، یہ قصہ ایک اسطورہ میں ہے جو ان 'خالقوں' کی نامردی کی ہیبت ناک تصویر پیش کرتی ہے، وہ انسانوں کی روزمرہ زندگیوں سے اس قدر دور تھے کہ وہ حاشیے پر چلے گئے۔لوگ بعل کی مقدس طاقت کا تجربہ ہر طوفانی بارش میں کرتے تھے، وہ اندر کی قوت کو ہر اس موقع پر محسوس کرتے جب وہ جنگ کی ماورائی غضبناکی سے مغلوب ہوتے۔لیکن پرانے سماوی خدا لوگوں کی زندگیوں سے ہرگز دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔اس بالکل ابتدائی تبدیلی ہی سے واضح ہو گیا کہ اساطیر اگر فوق الفطرت ہستی پر مرتکز رہیں گی تو کامیاب نہیں ہوں گی۔اگر اساطیر بنیادی طور پر انسانیت سے متعلق رہیں گی تو اسی صورت میں اہم سمجھی جائیں گی۔

سماوی خدا کی یہ تقدیر ہمیں ایک دوسری مقبول عام غلط فہمی کی یاد دلاتی ہے۔اکثر سمجھا جاتا ہے کہ ابتدائی اساطیر نے قبل سائنسی دنیا میں لوگوں کو کائنات کے نقطہ آغاز سے متعلق معلومات دیں۔سماوی خدا کی یہ کہانی اسی قسم کے قیاسی نظریے کا پتا دیتی ہے، مگر یہ اسطورہ ناکام تھی، کیوں کہ یہ لوگوں کی عام روزمرہ زندگیوں سے غیر متعلق تھی، انہیں ان کی انسانی فطرت سے متعلق کچھ نہیں بتاتی تھی اور ان کے دیرینہ مسائل کے حل میں مدد نہیں دیتی تھی۔سماوی خداؤں کا خاتمہ اس بات کی وضاحت میں ہماری دست گیری کرتا ہے کہ آخر کیوں وہ خالق خدا، جس کی عبادت یہودی، عیسائی اور مسلمان کرتے ہیں، مغرب میں بہت سے لوگوں کی زندگیوں سے غائب ہو گیا ہے۔ایک اسطورہ واقعاتی علم نہیں دیتی، بلکہ بنیادی طور پر طرز عمل کی راہ نما ہے۔اس کی سچائی صرف اس وقت منکشف ہو سکتی ہے جب رسومیاتی یا اخلاقی طور پر اس پر عمل کیا جائے۔اگر اس کا مطالعہ ایک

www.MashalBooks.org

خالص علمی مفروضے کے طور پر کیا جائے تو یہ بعید اور نا قابل یقین ٹھہرتی ہے۔

سماوی خداؤں کے معزول کیے جا چکنے کے باوجود آسمان اپنی اس طاقت سے محروم نہیں ہوا کہ وہ لوگوں کو مقدس ہستی کی یاد دلاتا رہے۔ بلندی بدستور الوہیت کی اساطیری علامت رہی ہے جو دراصل حجری دور کی روحانیت کی یادگار ہے۔ اساطیر اور تصوف میں مرد اور عورتیں باقاعدگی سے آسمان کی طرف بڑھتے ہیں اور وجد اور ارتکاز کی رسومیات اور تیکنیکی وضع کرتے ہیں جو انہیں اس قابل بناتی ہیں کہ وہ ان بلند اٹھنے کی کہانیوں کو جامہ عمل پہنا سکیں اور شعور کی 'ارفع' حالت تک 'بلند' ہو سکیں۔ حکما دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ سماوی دنیا کے مختلف درجوں کی طرف بڑھتے ہوئے بالآخر الوہی دائرے تک پہنچے۔ یوگیوں کے بارے میں معروف ہے کہ وہ ہوا میں اڑتے ہیں، صوفی ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں، پیغمبر بلند و بالا پہاڑوں پر پہنچے اور یک بہ یک ایک ارفع طرز حیات کا آغاز کرتے ہیں۔[۱۱] جب لوگوں نے اس ماورائیت کی طرف آرزومندی کے ساتھ بڑھنا شروع کیا، جس کی نمائندگی آسمان کر رہا ہے تو انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ناپائیدار انسانی صورت حال سے بچ سکتے ہیں اور اس کی طرف جا سکتے ہیں، جو دور اور ماورا میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اساطیر میں پہاڑ اس قدر زیادہ مقدس ہیں، وہ آسمان اور زمین کے بیچ کا راستہ ہیں، نیز وہ ایسی جگہ ہیں جہاں حضرت موسیٰؑ جیسے لوگ اپنے خداؤں سے مل سکتے ہیں۔ ہوا میں، آسمان کی طرف اڑنے اور ارتقاع پانے کی اساطیر تمام ثقافتوں میں ملتی ہیں جو ماورائیت کی آفاقی خواہش اور انسانی صورت حال کو تنگنائے سے آزادی پانے کی خواہش ظاہر کرتی ہیں۔ ان اساطیر کے لغوی اور ظاہری مفہوم پر توجہ نہیں کرنی چاہیے۔ جب ہم حضرت عیسیٰؑ کے آسمان کی سمت بلند ہونے کے بارے میں پڑھتے ہیں تو ہم واقعی یہ تصور نہیں کرتے کہ وہ فضا میں گردش کر رہے ہیں۔ جب حضرت محمد ﷺ نے مکہ سے یروشلم کی طرف پرواز کی اور وہاں سے ایک زینے پر چڑھتے ہوئے تخت خداوندی تک پہنچے تو ہم اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ انہوں نے روحانی اکتساب کا ایک نیا درجہ عبور کر لیا۔ جب پیغمبر ایلیاہ ایک آتشیں رتھ میں آسمان کی طرف بڑھے تو انہوں نے انسانی صورت حال کی ناپائیداری کو شکست دے دی اور اس الوہی قلمرو میں داخل ہو گئے جو ہماری دنیوی تجربے سے ورا موجود ہے۔

اہل علم مانتے ہیں کہ 'اوپر اٹھنے' کی ابتدائی اساطیر حجری دور سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ اس

شمن سے وابستہ ہیں جو شکار پیشہ معاشروں کا بزرگ پروہت تھا۔ شمن جذب اور وجد و سرمستی کا ماہر تھا، جس کے کشف اور خوابوں میں شکار کے مخصوص رویوں اور طرز عمل کا احاطہ کیا گیا ہوتا تھا اور انہیں روحانی معنی سے ہمکنار کیا گیا ہوتا تھا۔ شکار انتہائی خطرناک تھا۔ بعض اوقات شکاریوں کو کئی دنوں کے لئے اپنے قبائل سے دور رہنا پڑتا، اپنی غاروں کے محفوظ ٹھکانوں کو ترک کرنا پڑتا اور اپنے لوگوں کے لئے خوراک لانے کیلئے اپنی زندگیوں کو خطرے میں ڈالنا پڑتا۔ لیکن، جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، یہ محض ایک عملی، نتیجہ پسند سرگرمی نہیں تھی، بلکہ تمام دیگر سرگرمیوں کی طرح اس کی بھی ایک ماورائی جہت تھی۔ شمن تلاش کے سفر پر بھی نکلتا تھا، مگر یہ اصلاً روحانی مہم ہوتی تھی، یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے پاس اپنے جسم کو ترک کرنے اور اپنی روح کے ساتھ سماوی دنیا میں سفر کرنے کی شکتی ہے۔ جب وہ حالت جذب میں ہوتا تو ہوا میں اڑتا اور اپنے لوگوں کی خاطر دیوتاؤں سے بات چیت کرتا۔

فرانس کے لاساکس (Lascaux) اور سپین کے التمرا میں ابتدائی حجری دور کے معبد غار میں ہمیں شکار کی تصویریں ملتی ہیں، جن میں شکاریوں اور جانوروں کے پہلو بہ پہلو ایسے آدمی موجود ہیں جنہوں نے پرندوں کے نقاب پہنے ہوئے ہیں، یہ ان کے اڑان بھرنے کا اشارہ دیتے ہیں، یہ لوگ غالباً شمن (Shaman) تھے۔ حتیٰ کہ آج بھی سائبیریا سے لے کر تائیرا دل نیوگو (Tierr del Fuego) کے شکار پیشہ معاشروں کے شمن کا عقیدہ ہے کہ جب ان پر حالت جذب طاری ہوتی ہے تو وہ آسمان پر جا پہنچتے ہیں اور دیوتاؤں سے کلام کرتے ہیں، بالکل ایسے جیسے ماضی بعید کے عہد زریں میں تمام لوگ کرتے تھے۔ ایک شمن کو وجد و سرمستی کی تیکنیکوں کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ بعض اوقات اسے اپنے زمانہ بلوغت میں خلل دماغ کے فتور کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو اس کی پرانے بیگانہ مذہب شعور سے علیحدگی اور ان قوتوں کی بازیافت کی علامت ہے جو بالکل ابتدائی عہد کے انسانوں کو دی گئی تھیں مگر اب کھو چکی ہیں۔ خصوصی رسومیاتی نشستوں میں شمن پر ڈھول تاشوں اور رقص کی سنگت میں، جذب کا عالم طاری ہوتا ہے۔ وہ اکثر ایک درخت یا کسی ایسے کھمبے پر چڑھ جاتا ہے جو اس درخت، پہاڑ یا زینے کی علامت ہوتا ہے جو کبھی آسمان اور زمین کو باہم ملاتا تھا۔[۱۲] ایک جدید شمن زمین کی گہرائیوں سے آسمان تک اپنے سفر کا احوال یوں بیان کرتا ہے:

''جب لوگ گاتے ہیں، میں رقص کرتا ہوں۔ میں زمیں میں داخل ہوتا

www.MashalBooks.org

> ہوں۔ میں ایسی جگہ کے اندر جاتا ہوں جو ایسی جگہ ہے جہاں لوگ پانی پیتے ہیں۔ میں ایک لمبا اور دور دراز کا سفر کرتا ہوں...... جب میں نمودار ہوتا ہوں تو پہلے ہی چڑھ رہا ہوتا ہوں۔ میں دھاگوں پر صعود کرتا ہوں، ان دھاگوں پر جو ادھر شمال میں پھیلے ہوئے ہیں......اور جب تم مقام خداوندی تک رسائی حاصل کرتے ہو تو تم خود کو کم تر بنا لیتے ہو......تم وہاں وہی کچھ کرتے ہو جو تمہیں کرنا چاہیے۔ پھر تم وہاں لوٹ آتے ہو جہاں پر کوئی ہے۔[۱۳]

شکاری کی پرخطر مہم کی طرح شمن کی تلاش بھی موت سے دوچار ہونے سے عبارت ہے۔ اپنے قبیلے میں واپس پہنچنے کے باوجود اس کی روح اس کے جسم سے غائب ہوتی ہے اور اسے اپنے ساتھیوں کی مدد سے دوبارہ زندہ ہونا پڑتا ہے جو ''تمہارے سر کو پکڑتے اور تمہارے چہرے کو تیزی سے ادھر ادھر گھماتے ہیں۔ بس اسی طرح سے تم دوبارہ زندہ ہوتے ہو۔ دوستو! اگر وہ تمہارے ساتھ ایسا نہ کریں تو تم مرجاؤ......تم بس مرجاؤ اور تم مرے ہوئے ہو''۔[۱۴]

روحانی اڑان میں جسمانی سفر شامل نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک جذب و مستی کی کیفیت ہے جس میں محسوس ہوتا ہے کہ روح نے جسم کو چھوڑ دیا ہے۔ بلند ترین آسمان کی طرف کوئی صعود اولاً زمین کی گہرائیوں میں نزول کے بغیر ممکن نہیں۔ ازمنہ اولیٰ کی اس روحانیت کے موضوعات ان روحانی اسفار میں بار بار ظاہر ہوتے رہے ہیں جو تمام ثقافتوں کے صوفیوں اور یوگیوں نے اختیار کیے۔ یہ انتہائی معنی خیز بات ہے کہ روحانی صعود کی یہ اساطیر اور رسومات کا سلسلہ انسانی تاریخ کے بالکل ابتدائی دور تک جا پہنچتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انسانیت کی بنیادی آرزوؤں میں سے ایک آرزو انسانی حالت سے بلند ہونا ہے۔ بنی نوع انسان نے جوں ہی اپنا ارتقائی عمل مکمل کر لیا تو اسے معلوم ہوا کہ ماورائیت کی طلب اس کی صورت حال ہی میں رکھ دی گئی ہے۔

شمن فقط شکار پیشہ معاشروں میں کارفرما ہوتے ہیں اور جانور ان کی روحانیت میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک جدید شمن بعض اوقات اپنی تربیت کے دوران میں جنگل میں جانوروں کے ساتھ رہتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی ملاقات ایک جانور سے ہوگی جو اسے جذب و مستی کے بھیدوں کی تعلیم دے گا، جانوروں کی زبان سکھائے گا اور اس کا مستقل رفیق بنے

گا۔ اسے مراجعت نہیں گردانا جاتا، شکار پیشہ معاشروں میں جانوروں کو کم تر مخلوق تصور نہیں کیا جاتا، بلکہ اعلیٰ درجے کی دانش کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ جانور طول عمر اور لافانیت کے راز جانتے ہیں، لہٰذا ان کے ساتھ سلسلہ کلام جوڑنے سے شمن کی زندگی میں عمدہ خصوصیات کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ہبوط آدم سے پہلے کے عہد زریں میں بنی آدم جانوروں سے گفتگو کر سکتے تھے اور شمن جب تک زوال آدم سے پہلے کی یہ صلاحیت دوبارہ حاصل نہیں کر سکتا، وہ الوہی دنیا کی طرف صعود نہیں کر سکتا۔[۱۵] تاہم اس کے آسمانی سفر کا ایک عملی مقصد بھی ہوتا ہے۔ ایک شکاری کی طرح وہ اپنے لوگوں کے لئے خوراک لاتا ہے۔ مثال کے طور پر گرین لینڈ کے اسکیمو کا عقیدہ ہے کہ دریائی بچھڑے اس دیوی سے تعلق رکھتے ہیں، جسے ''جانوروں کی مالکہ'' کہا جاتا ہے۔ جب کبھی شکار میں کمی واقع ہوتی ہے تو شمن کو اس کے شبہات دور کرنے اور یوں قحط کے خاتمے کیلئے بھیجا جاتا ہے۔[۱۶]

اس امر کا امکان ہے کہ ابتدائی حجری دور کے لوگوں کی اساطیر اور رسومیات اسی طرح کی تھیں۔ یہ ایک نہایت اہم واقعہ ہے کہ ''موجودہ نوع انسانی'' (Homo Sapiens) بھی شکاری گوریلا تھا، جو دوسروں جانوروں کی تاک میں رہتا، انہیں جان سے مارتا اور کھا لیا کرتا تھا۔[۱۷] حجری اساطیر کی ایک بڑی خصوصیت ان جانوروں کو حد درجہ تعظیم دینا ہے، جنہیں اب انسان مارنے پر مجبور محسوس کرتا تھا، انسانوں کے پاس شکار کا کوئی اچھا ساز و سامان نہیں تھا، کیوں کہ وہ اپنے زیادہ تر شکار کے مقابلے میں کمزور اور چھوٹے تھے۔ اس کمی کے ازالے کیلئے انسانوں کو نئے ہتھیار اور تیکنیک وضع کرنا پڑیں۔ لیکن سب سے زیاد دقت طلب نفسیاتی دو جذبی رجحان (ambivalance) تھا۔ ماہرین بشریات اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ جدید مقامی لوگ اکثر جانوروں یا پرندوں کا ذکر خود اپنی طرح اور درجے کے ''لوگوں'' کے طور پر کرتے ہیں۔ وہ ایسی کہانیاں بیان کرتے ہیں جن میں انسان جانور بن جائے اور جانور انسانوں میں بدل جاتے ہیں، ایک جانور کا قتل اپنے دوست کا قتل سمجھا جاتا، اس لئے قبائلی لوگ اپنی کامیاب شکاری مہم کے بعد اکثر احساس جرم میں مبتلا ہو جاتے۔ چونکہ شکار ایک مقدس سرگرمی ہے اور اس سے شدید نوعیت کا اضطراب وابستہ ہے، اس لئے اسے متبرک رسم کے تکلفات سے آراستہ کیا گیا اور رسومات اور ممنوعات (Taboos) کا پابند بنا دیا گیا۔ شکار پر روانہ ہونے سے پہلے، ایک شکاری کے لئے لازم

www.MashalBooks.org

تھا کہ وہ جنسی عمل سے پرہیز کرے اور خود پر عبادتی پاکیزگی کی حالت طاری رکھے، جانور کو مارنے کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے الگ کر دیا جاتا اور اس کے ڈھانچے، کھوپڑی اور کھال کو احتیاط کے ساتھ پھیلا دیا جاتا جو دراصل جانور کی تشکیل نو اور حیات تازہ کی کوشش ہوتی۔[۱۸]

لگتا ہے کہ بالکل ابتدائی شکاری بھی اسی طرح کا دوجذبی رجحان یعنی جانوروں کو تعظیم دینے اور قتل کرنے کے متضاد جذبات کے حامل تھے۔ انہیں ایک سخت مشکل سبق سیکھنا تھا۔ قبل زرعی دور میں انسان اپنی خوراک خود اگانے سے قاصر تھے، اس لیے ان کے لئے اپنی زندگی کے تحفظ کا مطلب ان دوسری مخلوقات کا خاتمہ تھا، جنہیں وہ خود اپنی ہی طرح محسوس کرتے تھے۔ ان کے بڑے شکار وہ بڑے بڑے ممالیہ جانور تھے جن کے جسم اور چہروں کے تاثرات خود ان سے ملتے جلتے تھے۔ شکاری ان [جانوروں] کے خوف کو دیکھ سکتے تھے اور ان کی دہشت کی چیخوں کو خود اپنی چیخوں کے طور پر پہچان سکتے تھے۔ ان کا خون انسانی خون ہی کی طرح بہتا تھا۔ انہوں نے اس ناقابل برداشت دبدبے کا سامنا کر کے ایسی اساطیر اور رسومیات تخلیق کیں جنہوں نے انہیں اپنی ساتھی مخلوقات کے قتل سے سمجھوتہ کرنے کے قابل بنایا، ان میں سے کچھ اساطیر بعد کی ثقافتوں میں باقی رہ گئی ہیں۔ حجری دور کے خاتمے کے ایک عرصے بعد تک لوگ جانوروں کو ذبح کرنے اور کھانے سے متعلق ناخوشی محسوس کرتے رہے۔ عہد عتیق کے تمام مذہبی نظاموں میں جانوروں کی قربانی کی رسم مرکزی اہمیت رکھتی تھی، جس میں شکار کی قدیم رسمیں موجود تھیں اور جس میں ان درندوں کی تعظیم کی گئی تھی جنہوں نے بنی نوع انسان کی خاطر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے۔

خیال چہ اساطیر کی پہلی بڑی نمو اس وقت ہوئی جب ''ہومیوسیپنز''، ''ہومونیکنس''، یعنی مارنے والا آدمی] میں بدل گیا اور اسے پر تشدد دنیا میں اپنے وجود کی صورت حال کو قبول کرنا مشکل لگا۔ اساطیر عام طور پر بنیادی عملی مسائل سے متعلق اس گہرے اضطراب سے جنم لیتی ہیں، جس کی تسکین خالص منطقی دلائل سے نہیں کی جاسکتی۔ انسان اپنی جسمانی کمزوریوں کے ازالے کیلئے اپنے غیر معمولی بڑے دماغ کی استدلالی قوتوں کو ترقی دینے کے قابل تھے، خاص طور پر جب انہوں نے شکار کی مہارتیں پیدا کیں۔

انہوں نے ہتھیار ایجاد کیے اور اپنے معاشرے کو زیادہ سے زیادہ لیاقت کے ساتھ منظم کرنا

اور ایک ٹیم کی صورت میں مل جل کر کام کرنا سیکھا۔ اس ابتدائی مرحلے پر ہی ''ہوموسیپنز'' اس شے کو ترقی دے رہا تھا، جسے یونانیوں نے ''لوگوس'' کا نام دیا ہے، یعنی منطقی، عملیت پسند اور سائنسی طرز فکر، جس نے انہیں دنیا کو کامیابی کے ساتھ برتنے کے قابل بنایا۔

''لوگوس'' اساطیری فکر سے قطعی مختلف ہے۔ اسطورہ کے برعکس، لوگوس معروضی حقائق سے مکمل ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی ذہنی سرگرمی ہے، جسے ہم اس وقت کام میں لاتے ہیں، جب ہم خارجی دنیا میں چیزوں کو رونما ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں یعنی جب ہم سماج کی تنظیم کرتے یا ٹیکنالوجی وجود میں لاتے ہیں۔ اساطیر کے مقابلے میں یہ لازمی طور پر عملیت پسند ہوتا ہے۔ جہاں اساطیر مقدس آرکی ٹائپ کی تخیلی دنیا یا جنت گم گشتہ کی طرف واپسی کی نظر ڈالتی ہیں، وہاں لوگوس بتدریج آگے کی طرف بڑھتا ہے، کوئی نئی شے ایجاد کرنے، پرانی بصیرتوں کی اصلاح کرنے، حیرت انگیز ایجادات وجود میں لانے اور ماحول پر زیادہ سے زیادہ قدرت پانے کی مستقل کوشش کرتا ہے۔ تاہم اسطورہ اور لوگوس دونوں کی اپنی اپنی حدود ہیں۔ قبل جدید دنیا میں اکثر لوگوں نے یہ جان لیا تھا کہ اسطورہ اور استدلال ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، ہر ایک کا اپنا دائرہ عمل ہے، ہر ایک کی صلاحیت کا مخصوص منطقہ ہے اور انسانوں کو فکر کی یہ دونوں طرزیں درکار ہیں۔ ایک اسطورہ شکاری کو نہیں بتا سکتی کہ اسے شکار کو کیسے مارنا ہے یا ایک مہم کو کامیابی کے ساتھ کیسے منظم کرنا ہے، مگر اس نے جانوروں کے قتل سے متعلق پیچیدہ جذبات سے عہدہ برآ ہونے میں ضرور مدد دی۔ لوگوس کارگر، عملی اور استدلالی تھا لیکن یہ نہ تو انسانی زندگی کی قدر مطلق کا جواب دے سکتا تھا نہ انسانی درد اور تاسف کو زائل کر سکتا تھا۔[۱۹] اس لیے بالکل ابتداء ہی سے ''ہوموسیپنز'' نے جبلی طور پر سمجھ لیا کہ اسطورہ اور لوگوس کے الگ الگ کام ہیں۔ اس نے لوگوس کو نئے آلات کی تیاری میں استعمال کیا اور اسطورہ اور اس کی رسومات کو زندگی کے ان المیہ حقائق سے ہم آہنگ ہونے میں برتا جو اس کو بے بس کر دینے کا ڈراوا دیتے اور اسے ٹھیک طرح عمل کرنے سے روکتے تھے۔

التمیرا اور لاساؤکس کے غیر معمولی زیرزمین تاریک غار ہمیں حجری دور کی روحانیت کی للچا دینے والی جھلک دکھاتے ہیں۔[۲۰] ان گہرے زیرزمین اندھیری غاروں میں، جس تک رسائی بے حد مشکل ہے، ہرنوں، کوہان دار بیلوں اور اونی ٹٹوؤں اور جانوروں کے بھیس میں شمن اور بھالے پکڑے شکاریوں کی پرہیبت تصویروں کو حد درجہ احتیاط اور مہارت سے بنایا گیا ہے۔ یہ خوش

www.MashalBooks.org

منظر کھوہ غالباً ابتدائی مندر اور گرجا ہیں۔ ان غاروں کے معنی سے متعلق لمبی چوڑی علمی بحثیں ہوئی ہیں۔ یہ تصویریں شاید ان مقامی کہانیوں (لیجنڈ) کی عکاسی کرتی ہیں جنہیں ہم کبھی نہیں جان پائیں گے۔ تاہم ان سے انسانوں اور خدا نما، آرکی ٹائپل جانوروں کے پرشوق ربط کی ابتدائی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو غاروں کی دیواروں اور چھتوں کی زینت ہیں۔ زائرین کو اس خوش منظر کھوہ تک رسائی سے پہلے سیلن زدہ اور خطرناک زیرزمین سرنگوں میں رینگنا پڑتا ہے؟ اس سے پہلے کہ وہ مصوّر وحوش کے روبرو ہوں، انہیں قلب ظلمات کے گہرے بھٹ کو سہج سہج پار کرنا ہوتا ہے۔ ہمارا سامنا یہاں تصویروں اور خیالات کی اسی پیچیدگی سے ہوتا ہے، جس سے شمن کی تلاش عبارت ہے۔ شمن کی تربیتی نشستوں کی طرح، ان غاروں میں بھی غالباً موسیقی، رقص اور گیت ہوتے تھے، یہاں بھی دوسری دنیا کی طرف سفر تھا جو زمین کی گہرائیوں میں اترنے سے شروع ہوتا تھا اور جانوروں سے کلام تھا، جس کی ایک طلسمی جہت تھی، مادی، زوال یافتہ دنیا سے جدا۔

یہ تجزیہ نئے لوگوں کے لئے خصوصاً پراثر ہوتا ہوگا، جو ان غاروں میں پہلے کبھی داخل نہیں ہوئے ہوتے تھے اور اس بات کا امکان ہے کہ ان غاروں کو ان رسومیات بسم اللہ کیلئے استعمال کیا جاتا ہوگا جو قبائل کے نوجوانوں کی شکاریوں کی صورت قلب ماہیت کرتی تھیں۔ بسم اللہ کی رسومات قدیم مذاہب میں مرکزی اہمیت رکھتی تھیں اور روایتی معاشروں میں آج بھی نہایت اہم سمجھی جاتی ہیں۔[۲۱] قبائلی گروہوں میں بالغ لڑکوں کو ان کی ماؤں سے آج بھی الگ کر دیا جاتا ہے۔ انہیں گروہ سے جدا کر کے ایک ایسی سخت آزمائش سے گزارا جاتا ہے جو انہیں مردوں میں بدل دیتی ہے۔ شمن کے سفر کی طرح، یہ موت اور جنم تازہ کا عمل ہے۔ لڑکے کو اپنے بچپن کی موت سے گزرنا پڑتا ہے تا کہ وہ بلوغت کی ذمہ داریوں کی دنیا میں داخل ہو سکے۔ نئے ارکان [لڑکوں] کو زمین میں یا مقبرہ میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ انہیں راکشس نگل جائے گا یا بھوت پریت مار ڈالیں گے۔ انہیں شدید جسمانی تکلیف اور ظلمات کے سپرد کیا جاتا ہے، عموماً اس کے ختنے کیے جاتے یا ان کی جلد کو گودا جاتا ہے۔ یہ تجربہ اس قدر شدید اور لرزا دینے والا ہوتا ہے کہ نیا رکن [لڑکا] ہمیشہ کیلئے تبدیل ہو جاتا ہے۔ ماہرین نفسیات بتاتے ہیں کہ اس قسم کی تنہائی اور محرومی نہ صرف شخصیت میں اس بدنظمی کو پیدا کرتی ہے جو ماضی کے کسی عہد کی طرف لوٹاتی ہے بلکہ، اگر اسے ٹھیک طرح سے قابو میں رکھا جائے تو یہ اس شخص کی باطنی گہری قوتوں کو از سر نو منظّم بھی کرتی

ہے۔ اس سخت آزمائش کے خاتمے پر لڑکا یہ جان چکا ہوتا ہے کہ موت ایک نیا آغاز ہے۔ اپنے لوگوں میں اس کی واپسی ایک مرد کے جسم اور روح کے ساتھ ہوتی ہے۔ سر پر کھڑی موت کا سامنا کر کے اور یہ آگہی حاصل کر کے کہ یہ سب وجود کی ایک نئی صورت تک پہنچنے کی رسم ہے، وہ اس بات کیلئے تیار ہو جاتا ہے کہ ایک شکاری یا جنگ جو بن کر وہ اپنے لوگوں کے لئے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دے۔

رسم بسم اللہ کی دہشت اور صدمے کے دوران ہی میں ایک مبتدی اپنے قبیلے کی انتہائی مقدس اساطیر کو پہلی مرتبہ سنتا ہے۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ اسطورہ ایک ایسی کہانی ہے جسے دنیوی اور ادنیٰ ماحول میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ یہ مقدس علم کی تعلیم دیتی ہے، اس لئے اسے ریت رسم کے ماحول میں دہرایا جاتا ہے جو اسے تمام دنیوی تجربے سے الگ کرتا ہے اور اسے روحانی اور نفسیاتی قلب ماہیت کے مقدس تناظر ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔[۲۲] اساطیریات ایک ایسا کلامیہ (ڈسکورس) ہے، جس کی ہمیں انتہائی ضرورت ہے۔ ہمیں اس بات کے لئے تیار رہنا چاہیے کہ اسطورہ ہمیں ہمیشہ کیلئے تبدیل کر سکے۔ ان رسوم کے علاوہ جو سامع اور کہانی کے درمیان رکاوٹ کو توڑ سکیں اور سامع کو اسے اپنی کہانی سمجھنے میں مدد دیں، اساطیری بیانیے کا مقصد مانوس دنیا کے محفوظ تیقنات سے ماورا نامعلوم دنیا میں پہنچانا ہے۔ ایک اسطورہ کی قلب ماہیت والی رسوم کے بغیر قرأت اسی قدر نامکمل تجربہ ہے جس قدر اوپیرا کے گیتوں کو اس کی موسیقی کے بغیر محض پڑھنا ہے جب تک اسطورہ کا تجربہ حیات نو، موت اور جنم تازہ کے عمل کے طور پر نہ ہو، اس کا کوئی مطلب ہی نہیں۔

یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ لاساؤکس کی طرح کے معبدوں کی رسوم کے تجربے اور شمن اور شکار کے تجربے ہی سے ہیرو کی ارسطو کا جنم ہوا۔ شکاری، شمن اور مبتدی سب کو جانی پہچانی چیزوں کو خیرباد کہنا پڑتا اور خوف زدہ کر دینے والی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ان سب کو اپنے قبیلے کے لئے غذائی سامان سمیت لوٹنے سے پہلے پرتشدد موت کے امکان کا سامنا کرنا پڑتا۔ سورمائی مہم سے متعلق عام ثقافتوں نے ملتی جلتی اساطیر وضع کی ہیں۔ سورما یا ہیرو کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی اپنی زندگی یا اس کے قبیلے میں کسی شے کی کمی ہے۔ وہ خیالات جن سے اس کے قبیلے کی نسل در نسل نشوونما ہوئی ہے، اب اس سے ہم کلام نہیں ہوتے۔ لہٰذا وہ گھر سے موت کو للکارنے والی مہموں کو

www.MashalBooks.org

جھیلنے کے لئے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ وہ راکشسوں سے جنگ کرتا ہے، انتہائی دشوار گزار پہاڑوں پر چڑھتا ہے، تاریک جنگلوں کو روندتا ہے اور اس عمل میں اس کی پرانی شخصیت دم توڑ دیتی ہے اور وہ نئی بصیرت یا مہارت اپنے لوگوں کے لئے حاصل کرتا ہے۔ پرومیتھیس نے انسانیت کے لئے دیوتاؤں سے آگ چرائی اور اسے قرنوں تک اذیت ناک سزا جھیلنا پڑی، اینیاس کو روم کے نئے شہر تک رسائی سے پہلے اپنی پرانی زندگی کو پیچھے چھوڑنے پر، اپنے گھر کو شعلوں میں گھرا دیکھنے پر اور پاتال میں اترنے پر مجبور ہونا پڑا۔ پس ہیرو کی اسطور اس طرح ڈھالی گئی ہے کہ مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ جیسی تاریخی شخصیات کی سوانح اس طور بیان ہوئی ہے جو اس آرکی ٹائپل ساخت کے مطابق ہے جو غالباً پہلی مرتبہ حجری زمانے میں وضع ہوئی۔

علاوہ بریں جب لوگوں نے اپنے قبیلے کے ہیروؤں سے متعلق یہ کہانیاں سنائیں تو وہ اپنے سامعین سے محض تفریح طبع کی امید نہیں کر رہے تھے، اسطور ہمیں بتاتی ہے کہ ہمیں مکمل انسانی شخصیت بننے کے لئے کیا کرنا چاہیے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی زندگی میں کسی وقت ہیرو بننا پڑتا ہے۔ ہر بچہ جنمی گزرگاہ کے تنگ راستے سے مجبوراً گزر کر، جو لاساؤکس کی کنجلک سرنگوں سے مختلف نہیں، کوکھ کا تحفظ ترک کرتا ہے اور دہشت ناک اجنبی دنیا میں داخل ہونے کے جذباتی صدمے کا سامنا کرتا ہے۔ ہر ماں بھی ایک ہیرو ہے جو بچے کو جنم دیتی ہے اور اپنے بچے کیلئے موت کا خطرہ مول لیتی ہے۔[۲۳] آپ ہیرو نہیں ہو سکتے، جب تک آپ ہر شے کو ترک کرنے پر تیار نہیں ہوتے؟ بلندیوں کی طرف صعود ممکن نہیں، اگر پہلے تاریکی کی طرف نزول نہ ہو، اسی طرح موت کی کسی صورت کے بغیر کوئی نئی زندگی نہیں، ہم زندگی پھر اپنے آپ کو ایسی صورت حال میں پاتے ہیں جن میں ہم نامعلوم کے دوبدو ہوتے ہیں، ایسے میں ہیرو کی اسطور ہماری راہ نمائی کرتی ہے کہ ہمیں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ ہم سب کو ایک حالت سے دوسری حالت میں جانے کی حتمی رسم کا سامنا کرنا ہے، یعنی موت کا۔

حجری عہد کے بعض ہیرو بعد کے اساطیری ادب میں باقی رہ گئے ہیں۔ مثلاً یونانی ہیرو ہرکولیس کم و بیش یقینی طور پر شکاری دور کی یادگار ہے۔[۲۴] وہ غار کے آدمی کی طرح جانوروں کی کھال پہنتا ہے اور چھڑی لیے ہوتا ہے۔ ہرکولیس ایک شمن ہے جو جانوروں کے سلسلے میں مہارت رکھنے میں مشہور ہے، وہ پاتال میں اتر کر لافانیت کا پھل تلاش کرتا ہے اور پھر کوہ اولمپس پر

دیوتاؤں کی مملکت میں صعود کرتا ہے۔ علاوہ ازیں یونانی دیوی آرتمس جو "جانوروں کی ملکہ"[۲۵] کے طور پر جانی جاتی، شکار کرنے والی اور ان سدھی فطرت کی سرپرست ہے، حجری عہد کی ایک شبیہہ ہو سکتی ہے۔[۲۶]

ہر چند شکار خصوصی طور پر مردانہ سرگرمی تھی، مگر حجری زمانے کے انتہائی طاقتور شکاریوں میں عورت بھی تھی۔ حاملہ عورت کی ابتدائی چھوٹی مورتیاں جو افریقہ، یورپ اور وسط ایشیاء میں جا بجا ملی ہیں، اسی زمانے سے تعلق رکھتی ہیں، آرتمس اس عظیم دیوی اور لرزہ خیز الوہیت کی تجسیم ہے جو نہ صرف جانوروں کی ملکہ تھی بلکہ زندگی کا سرچشمہ بھی تھی۔ تاہم وہ پرورش کرنے والی مادر ارض نہیں بلکہ سخت دل، منتقم مزاج اور تقاضا کرنے والی ہے۔ اگر شکار کی رسومات کی خلاف ورزی کی جائے تو آرتمس خود قربانی اور خون افشانی کا تقاضا کرنے میں بدنام ہے۔ یہ دہشت انگیز دیوی بھی حجری عہد کے بعد باقی رہ گئی ہے۔ ماہرین بشریات نے ترکی کے قصبے کیٹل ہویوک (Catal Huyuk) کی کھدائی کے دوران میں، جس کا زمانہ ساتویں یا چھٹے ہزاریے کا ہے، ابھرواں سنگ تراشی کے ایسے نمونے دریافت کیے ہیں جن میں دیوی بچے کی پیدائش کا عمل انجام دے رہی ہے۔ وہ بعض اوقات جانوروں، بیلوں کے سینگوں یا ریچھ کی کھوپڑیوں میں گھری ہوئی ہے جو کامیاب شکار کی یادگار اور مرد کی علامات ہیں۔

ایک حد درجہ مردانہ معاشرے میں ایک دیوی کیوں غالب ہو گئی؟ ایسا شاید عورت کی لاشعوری ناراضی کی وجہ سے ہوا۔ کیٹل ہویوک کی دیوی ابدی طور پر بچے کو جنم دیتی ہے، مگر اس کے رفیق حیات بیل کو لازماً مرنا ہوتا ہے۔ شکاریوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کی نگہداشت کی خاطر اپنی زندگیاں خطرے میں ڈالیں۔ شکار کے پیدا کردہ احساس جرم اور اضطراب نے، جس میں رسمی برہمچاریت کی مایوسی بھی شامل تھی، اس طاقتور عورت کی تمثال میں دخل حاصل کر لیا جو کبھی ختم نہ ہونے والی قتل و غارت کا مطالبہ کرتی ہے۔[۲۷] شکاری یہ بات سمجھ سکتے تھے کہ عورتیں نئی زندگی کا سرچشمہ ہیں یا یہ عورتیں ہی ہیں، نہ کہ صرف ہو جانیوالے مرد، جو قبیلے کے تسلسل کو یقینی بناتی ہیں۔ اس طور عورت خود زندگی کی پرجلال شبیہہ بن گئی۔ اس زندگی کی جسے مردوں اور جانوروں کی نامختتم قربانی درکار تھی۔

ہمارے حجری ماضی کی یہ منتشر جھلکیاں ظاہر کرتی ہیں کہ اساطیر کوئی نفس پرستانہ امرت نہیں

www.MashalBooks.org

تھیں ۔اساطیر نے مردوں اور عورتوں کو زندگی اور موت کی کٹھور حقیقتوں کا مقابلہ کرنے پر مجبور کیا۔ انسانوں کے پاس المیہ بصیرت تھی ۔انہوں نے آسمانوں کو ماپنے کی آرزو کی، تاہم انہوں نے سمجھ لیا کہ اس کیلئے انہیں اپنی فنا پزیری کا سامنا کرنا ہوگا، محفوظ دنیا کو پیچھے چھوڑنا ہوگا، گہرائیوں میں اترنا اور اپنی پرانی شخصیتوں کو منہدم کرنا ہوگا۔ اساطیر اور اس سے متعلقہ رسومات نے حجری لوگوں کی زندگی کے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہونے میں مدد کی، ایک ایسے انداز میں کہ جب بالآخر موت آ پہنچی تو اسے ایک دوسرے قطعی نامعلوم طرز وجود کی آخری اور حتمی شروعات کے طور پر دیکھا گیا۔ یہ ابتدائی بصیرت کبھی گم نہیں ہوئی بلکہ عورتوں اور مردوں نے جب انسانی تاریخ کے اگلے عظیم انقلاب میں قدم رکھا تو یہ بصیرت راہنمائی کیلئے ان کے ہم رکاب تھے۔

☆☆☆

www.MashalBooks.org

اواخر حجری عہد: دہقانوں کی اساطیر

(8000 تا 4000 ق م)

تقریباً دس ہزار سال پہلے بنی نوع انسان نے زراعت ایجاد کی۔ شکار اب ان کی خوراک کا بڑا ذریعہ نہیں رہا تھا، کیوں کہ انہوں نے دریافت کر لیا تھا کہ زمین بادی النظر میں غذا کا بے نہایت منبع ہے۔ کچھ نئی باتیں ظہور پذیری ہوئیں جو نسل انسانی کے لئے اواخر حجری دور کے زرعی انقلاب سے زیادہ اہم تھیں۔ ہم ان پیش رو کسانوں کی اس دیو مالا میں ہیبت، مسرت اور دہشت کو محسوس کر سکتے ہیں، جو نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کے دوران میں وضع ہوئی اور جس کے ٹکڑے بعد کی ثقافتوں کے اساطیری بیانیوں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ زراعت لوگوں کی پیداوار تھی مگر ہمارے زمانے کے ٹیکنالوجی کے انقلاب کی مانند اسے خالص سیکولر سرگرمی نہیں سمجھا گیا تھا۔ یہ ایک عظیم روحانی بیداری کا محرک ہوا، جس نے لوگوں کو اپنے اور اپنی دنیا کے متعلق بالکل نیا فہم دیا۔

زراعت کی نئی سائنس کا ورود مذہبی ہیبت کے ساتھ ہوا۔[۲۸] اوائل حجری دور کے لوگوں نے شکار کو ایک مقدس عمل گردانا اور اب کاشت کاری بھی میثاق [مذہبی پیمان] ٹھہرے۔ جب کسان کھیتوں میں ہل چلاتے یا پکی ہوئی فصل اکٹھی کرتے تو رسمی پاکیزگی کی حالت میں ہوتے۔ جب وہ بیجوں کو زمین کی گہرائیوں میں اترتا دیکھتے اور انہیں معلوم ہوتا کہ وہ تاریکی میں پھوٹ پڑتے ہیں تاکہ زندگی کی نئی حیرت انگیز صورت کو سامنے لا سکیں تو کاشت کار ایک مخفی قوت کی کارفرمائی کو پہچان لیتے ہیں۔ فصل الوہی وجود کا ظہور تھا، ایک قسم کی متبرک توانائی کا کشف تھا اور جب دہقان زمین کاشت کرتے اور اپنے لوگوں کیلئے خوراک پیدا کرتے تو محسوس کرتے کہ وہ

ایک مقدس قلمرو میں داخل ہوئے اور معجزاتی فراوانی میں شریک ہوئے ہیں۔[۲۹] زمین تمام مخلوقات یعنی پودوں، جانوروں اور انسانوں کو باقی رکھنے کیلئے ایک زندہ کوکھ کی مانند تھی۔

اس طاقت کی تجدید و اضافے کے لئے رسومات وضع کی گئیں کہ یہ کہیں خود کو صرف نہ کر ڈالے۔ لہٰذا ابتدائی بیجوں کو نذرانے کے طور پر پھینک دیا جاتا اور پکی فصل کے ابتدائی پھلوں کو نہ چنا جاتا جو ان مقدس قوتوں کی بازگردانی کا ایک طریقہ تھا۔ اس بات کی شہادت بھی ملتی ہے کہ وسطی امریکہ، افریقہ کے کچھ حصوں، بحرالکاہل کے جزائر اور ہندوستان کے دراوڑی علاقوں میں انسانوں کی قربانی پیش کی جاتی تھی۔ ان مذہبی رسوم کی تہ میں دو اصول کام کر رہے تھے۔ ایک، آپ کچھ پیش کیے بغیر کچھ حاصل کرنے کی توقع نہیں کر سکتے، کچھ پانے کیلئے آپ کو کچھ دینا ہوگا۔ دوسرا حقیقت کا کلی کشف تھا۔ مقدس مظہر کو مابعد الطبیعیاتی حقیقت محسوس نہیں کیا جاتا تھا جو فطری دنیا سے ماورا ہوتی ہے۔ اس سے اور اس کے اثمار سے جو خود بھی مقدس تھے، زمین ہی پر مڈ بھیڑ ہوتی تھی، خداؤں، انسانوں، جانوروں اور پودوں کی فطرت یکساں تھی اور اسی بناء پر وہ سب ایک کو تقویت دیتے اور تجدید کر سکتے تھے۔

مثال کے طور پر انسانی جنسیت کو بنیادی طور پر اسی طرح کی ایک الوہی قوت گردانا جاتا تھا جو زمین کی بارآوری کرتی تھی۔ اواخر حجری عہد کی ابتدائی اساطیر میں فصل کی کٹائی کو مقدس ازدواج کا ثمر تصور کیا جاتا تھا، دھرتی عورت تھی، بیج الوہی نطفہ تھے اور بارش آسمان و زمین کا جنسی وصل تھا۔ عورتوں اور مردوں کے لئے فصلوں کی کاشت کے وقت رسمی جنسی عمل میں مبتلا ہونا ایک معمول تھا۔ ان کا اپنا جنسی ملاپ جو بجائے خود ایک مقدس فصل تھا، دھرتی کی تخلیقی توانائی کو متحرک کرتا تھا، اسی انداز میں جیسے کسان کا پھاوڑا یا ہل ایک مقدس عضو تناسل تھا جو زمین کی کوکھ کشادہ کرتا تھا اور بیج کی مدد سے اسے پھل دیتا تھا۔ بائبل بتاتی ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں قدیم اسرائیل میں ہوسیاہ (Hosea) اور ایزاکیل (Ezekiel) جیسے پیغمبروں کو طیش دلانے کیلئے شراب و رقص کی یہ رسوم منعقد کی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ یروشلم کے صومعے اور مقدس طوائفوں کے گھر میں کنعان کی زرخیزی کی دیوی اشیراہ کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے تقریبات منعقد ہوتی تھیں۔[۳۰]

بایں ہم اواخری حجری عہد کے انقلاب کے ابتدائی مرحلوں میں زمین کو ہمیشہ عورت کے طور پر نہیں دیکھا گیا۔[۳۱] چین اور جاپان میں وجود کی بنا جنسیت سے عاری تھی اور صرف بعد

www.MashalBooks.org

ازاں غالباً خاندانی زندگی میں عورت کے مادرانہ کردار کے نتیجے میں زمین نسوانی، پالنے پوسنے والے کردار کی حامل بنی۔ دنیا کے دیگر حصوں میں زمین کی تجسیم نہیں کی گئی بلکہ اسے بجائے خود مقدس سمجھ کر اس کی تعظیم کی گئی۔ وہ اپنی کوکھ سے تمام چیزوں کو اسی طرح پیدا کرتی تھی جس طرح عورت بچے کو جنم دیتی تھی۔ یورپ اور شمالی امریکہ کی تخلیق سے متعلق ابتدائی اساطیر میں سے بعض میں اولین انسانوں کی پیدائش کو پودوں کی طرح زمین سے نکلتے ہوئے تصور کیا گیا۔ بیجوں کی طرح ان کی زندگی زیرِ زمین شروع ہوتی تھی، یہاں تک کہ نئے لوگ سطح پر بڑھ آتے یا پھولوں کی طرح کھل پڑتے اور ان کی انسانی مائیں انہیں چن لیتیں۔[۳۲] جب ایک مرتبہ لوگوں نے الوہیت کا سامنا کرنے کے لئے بلندیوں کی طرف خود کو صعود کرتے ہوئے تصور کر لیا تو اب انہوں نے زمین پر اس سے رابطے کیلئے رسوم وضع کر لیں۔ اواخر حجری دور کے ایسے پیچ دار راستے دریافت ہوئے ہیں جو لاساؤکس کی اوائل حجری عہد کی سرنگوں کے مماثل ہیں۔ تاہم یہ پجاری مقدس جانوروں سے ملنے کیلئے زیرِ زمین غاروں میں جانے کے بجائے، یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ارض مادر کی کوکھ میں داخل ہو رہے ہیں اور کل وجود کے منبع کی طرف متصوفانہ واپسی ممکن بنا رہے ہیں۔[۳۳]

تخلیق سے متعلق ان اساطیر نے لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ زمین سے ان کا ٹھیک وہی تعلق ہے جو چٹانوں، دریاؤں اور درختوں کا ہے۔ لہٰذا دھرتی کے فطری آہنگ کا احترام ان پر لازم ہے۔ دیگر اساطیر میں جگہ سے ایک ایسی والہانہ نسبت کا اظہار ہوا جو خاندان یا پدریت کے تعلق سے کہیں گہری تھی۔ اس قسم کی دیومالا قدیم یونان میں خاص طور پر مقبول تھی۔ ایتھنز کا پانچواں اسطوری بادشاہ اریختھونیوس (Erechthonious) آرکوپولس کی مقدس سرزمین میں پیدا ہوا اور اس مقدس واقعے کو ایک خاص معبد میں ابتدائی زمانے سے منایا جاتا ہے۔

اواخر حجری عہد کے انقلاب نے لوگوں کو اس تخلیقی توانائی سے آگاہ کیا جو تمام کون و مکاں میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ ابتداء میں ایک بے ہیئت مقدس قوت تھی جس نے خود دھرتی کو الوہیت کا مظہر بنایا تھا، لیکن اسطوری تخیل ہمیشہ زیادہ ٹھوس اور واقعاتی ہو جاتا ہے۔ جو اصلاً بے ہیئت و بے صورت ہوتا ہے، وہ واضح ہوتا چلا جاتا اور مخصوص صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح فلک کی تعظیم سے آسمانی خدا کی تجسیم ہوئی اور نگہداشت کرنے والی دھرتی ماں،

دیوی ماں بن گئی۔ شام میں اسے یا تو آشیرہ کے طور پر پہنچانا گیا جو خدائے اعظم ال (El) کی شریک حیات تھی، یا پھر انات (Anat) کے طور پر جو ال کی دختر تھی، قدیم بابل، میسوپوٹیمیا میں اسے (Inanna) کہا گیا، مصر میں آئسس اور یونان میں وہ ہیرا، ڈیمیٹیر اور افروڈائٹ بن گئی۔ دیوی ماں، شکار پیشہ معاشروں کی مادرِ عظمیٰ کی بہت سی لرزہ خیز خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے آمیخت ہو گئی۔ مثلاً انات ایک سفاک جنگجو ہے اور اسے عام طور پر لہو کے سمندر کو ریلتے پیلتے دکھایا جاتا ہے۔ ڈیمیٹیر کو متشدد اور منتقم مزاج دکھایا جاتا ہے اور حتیٰ کہ محبت کی دیوی افروڈائٹ کو خوفناک انتقام پر مصر دکھایا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں، اساطیر فراریت پسند نہیں، اواخر حجری عہد کی نئی اساطیر نے لوگوں کو اس بات پر مجبور کیے رکھا کہ وہ موت کی حقیقت کا سامنا کریں۔ وہ دیہی منظر کشی کی حامل روحانی نظمیں نہیں تھیں اور دیوی ماں ایک نرم خو، ڈھارس دینے والی دیوی نہیں تھی، اس لیے کہ زراعت کا تجربہ ایک پرامن، گیان دھیان والے پیشے کے طور پر نہیں لیا گیا تھا۔ یہ بنجر پن، خشک سالی اور قحط اور فطرت کی ان متشدد قوتوں کے خلاف مستقل جنگ، ایک خطرناک جدوجہد تھی، جو مقدس طاقت کا مظہر تھیں۔[۳۴] بوائی کی جنسی تمثالوں کا یہ مطلب نہیں تھا کہ لوگوں نے زراعت کا تجربہ فطرت کے ساتھ رومانوی آشنائی کے طور پر کیا۔ انسانی پیدائش بجائے خود ماں اور بچے کے لئے انتہائی خطرناک تھی۔ اسی طرح فصل کاشت کرنے کیلئے زمین کی تیاری سخت محنت اور کمر توڑ مشقت کے بعد ممکن ہوتی تھی۔ کتاب پیدائش کے مطابق قدیمی جنت کی حالت کو کھونے کا تجربہ کاشت کاری میں مبتلا ہونے کی صورت کیا گیا ہے۔ عدن میں ابتدائی انسانوں نے خدا کے باغ کی خبرگیری بغیر کسی کوشش کے کی۔ گناہ آدم کے بعد عورت تاسف کے ساتھ بچے پیدا کرتی ہے اور آدمی کو زمین سے روزی حاصل کرنے کیلئے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔[۳۵]

ابتدائی اساطیر میں کاشت کاری تشدد سے لبریز ہے اور خوراک، موت اور تباہی کی مقدس قوتوں کے خلاف مستقل جنگ ہی سے پیدا ہوئی ہے۔ بیج کو زمین کی گہرائی میں جانا پڑتا اور مرنا پڑتا ہے تاکہ اس کا پھل پیدا ہو سکے اور بیج کی موت دردناک اور دہشت ناک ہے۔ کاشت کاری کے اوزار اسلحے کی طرح نظر آتے ہیں، غلے کو پیس کر سفوف بنا دیا جاتا ہے اور انگوروں کے شراب بننے سے پہلے انہیں روند کر بے ہیئت گودے میں بدلا جاتا ہے۔ یہ سب ہم دیوی ماں سے متعلق

اساطیر میں دیکھتے ہیں، جس کے تقریباً تمام رفقائے حیات فصلوں کے ساتھ نئی زندگی پانے سے پہلے جدا ہوتے، ٹکڑے ٹکڑے ہوتے، سفاکانہ طور پر بکھر جاتے اور مار دیئے جاتے ہیں۔ یہ تمام اساطیر موت سے جدوجہد کا بیان کرتی ہیں۔ اوائل حجری دور کے سورماؤں سے متعلق پرانی اساطیر میں یہ بات عام تھی کہ ایک مرد ہیرو اپنے لوگوں کی مدد کے لئے خطرناک سفر پر روانہ ہوتا تھا۔ اواخر حجری دور کے انقلاب کے بعد مرد عموماً بے بس اور بے عمل نظر آتے ہیں۔ اب نسائی دیوی تلاش کے سفر پر نکلتی ہے، موت سے لڑتی ہے اور نسل انسانی کی نشوونما کا اہتمام کرتی ہے۔ ارض مادران اساطیر میں اعلیٰ نسائی کردار کی خصوصیات کی علامت بنتی ہے، جو مطلقاً توازن اور نو یافت ہم آہنگی کا بیان ہیں۔

یہ بات طغیانی کے دیوتا بعل کی بہن اور شریک حیات انات کی اس اسطورہ میں واضح ہے جو نہ صرف کاشت کاری کی جدوجہد کی علامت ہے بلکہ کاملیت اور ہم آہنگی کے حصول میں پیش آنے والی دقت کی بھی۔ خود بعل جو گرم و خشک زمین کے لئے بارش لا رہا ہے، عفریتوں، انتشار اور انحطاط کی قوتوں کے خلاف مستقل تخلیقی جنگ میں مبتلا رہتا ہے تاہم ایک دن مرگ، بنجر پن اور خشک سالی کا دیوتا موت (mot) حملہ کرتا ہے، جو مستقل طور پر زمین کو ایک اجاڑ دشت میں بدلنے کی دھمکی دیتا ہے۔ 'موت' کے آنے پر ایک دفعہ تو بعل خوف سے مغلوب ہو جاتا ہے اور بغیر کسی مزاحمت کے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ 'موت' اسے بھیڑ کے بچے کے لقمے کی طرح چبا ڈالتی ہے اور اسے پامال، مردوں کی دنیا میں کھینچ لے جاتی ہے۔ چوں کہ اب بعل زمین کے لئے بارش نہیں لا سکتا، سبزہ عمومی سوگواری کی فضا میں مرجھاتا اور مر جاتا ہے۔ بعل کا باپ ال جو مثالی خدائے اعظم ہے، کچھ نہیں کر پاتا۔ جب اسے بعل کی موت کی خبر ملتی ہے، تو وہ اپنے تخت بلند سے نیچے اترتا ہے، ٹاٹ کا ماتمی لباس پہنتا ہے اور گردیے کی روایتی رسوم میں اپنے گالوں میں گہری کھرنچیں ڈالتا ہے، مگر اپنے بیٹے کو نہیں بچا سکتا۔ صرف انات ہی موثر دیوی ہوتی ہے۔ وہ رنج اور غصے سے بھری اور فکر و خوف سے بولائی ہوئی، اپنے نفس ناطقہ، اپنی ذات ثانی کی تلاش میں زمین میں ماری ماری پھرتی ہے۔ جس شامی متن میں یہ اسطورہ محفوظ رہ گئی ہے، وہ بتاتا ہے کہ وہ [انات] بعل کی اسی طرح مشتاق ہے، جس طرح، ایک گائے اپنے بچھڑے کیلئے یا بھیڑ اپنے بچے کیلئے ہوتی ہے۔[۳۶] دیوی ماں اسی طرح تندخو اور قابو سے باہر ہوتی ہے جس طرح

ایک جانور، جب اس کا بچہ خطرے میں ہو۔ جب انات کو بعل کی باقیات ملتی ہیں تو وہ اس کے اعزاز میں ایک عظیم تجہیزی ضیافت تیار کرتی ہے اور ال سے پر جوش شکایت کا اظہار کرتے ہوئے 'موت' کی تلاش جاری رکھتی ہے۔ جب وہ اسے ڈھونڈ لیتی ہے تو رسمی درانتی سے 'موت' کے دو ٹکڑے کر ڈالتی ہے، اسے چھلنی میں چھانتی پھٹکتی ہے، بدہئیت کر دیتی ہے، چکی میں پیس ڈالتی ہے اور اس کے ماس کو کھیتوں میں منتشر کر دیتی ہے، الغرض وہ اس سے وہی سلوک کرتی ہے جو ایک کسان اپنے اناج کے ساتھ کرتا ہے۔

ہمارے مآخذ نامکمل ہیں، اس لئے ہم نہیں جانتے کہ انات کس طرح بعل کو زندگی کی طرف واپس لا سکی۔ لیکن بعل اور 'موت' دونوں الوہی ہیں، لہٰذا کسی کو بھی پوری طرح تباہ نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں کی باہمی جنگ سدا جاری رہے گی اور ہر برس فصلوں کی کٹائی مرگ کے علی الرغم ہی ہوا کرے گی۔ اس دیومالا کے ایک نسخے کے مطابق، انات، بعل کو مکمل طور پر بحال کر دیتی ہے اور جب اگلی مرتبہ 'موت' اس پر دھاوا بولتا ہے تو وہ کہیں زیادہ شدت سے اس کا جواب دیتا ہے۔ بارشیں دھرتی کی طرف لوٹ آتی ہیں، وادیوں میں شہد بہنے لگتا ہے اور آسمان سے بیش قیمت تیل کی برسات ہوتی ہے، یہ کہانی بعل اور انات کے جنسی ملاپ پر ختم ہوتی ہے، جو کاملیت اور تکمیلیت کی تمثال ہے اور جسے نئے سال کی تقریب کے دوران میں ایک طریق عبادت کے طور پر سٹیج پر دوبارہ دکھایا جاتا ہے۔

ہم مصر میں ٹھیک یہی طور دیکھتے ہیں اگرچہ آئسس، انات کے مقابے میں کم طاقتور ہے۔ مصر کا پہلا بادشاہ اوسیرس اپنے لوگوں کو زراعت کی سائنس کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کا بھائی سیٹھ (Seth) جو تخت کا آرزومند ہے، اسے قتل کر دیتا ہے اور اس کی بہن اور شریک حیات آئسس اپنے جسم کی تلاش میں دنیا گھومتی ہے۔ جب اسے ایک لاش ملتی ہے تو وہ اسے اس وقت تک واپس زندگی دے سکتی ہے، جب تک وہ ہورس، اس کے بیٹے کو، جو اس کی پیڑھی کو جاری رکھتا ہے اس کو اپنے پیٹ میں ٹھہرانے کے قابل نہیں ہو جاتی اس کے بعد اوسیرس کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے اور ہر حصے کو بیج کی طرح پورے مصر میں مختلف جگہوں میں دفنا دیا جاتا ہے۔ وہ مردوں کو دنیا دوات (Duat) کا حکمران بن جاتا ہے اور فصلوں کی سالانہ کٹائی کا ہر برس ذمہ دار ہوتا ہے، فصلوں کو کاٹنے اور گاہنے کے ساتھ ساتھ اس کی موت اور ٹکڑے ٹکڑے کیے جانے کی رسم ادا کی

www.MashalBooks.org

جاتی ہے۔ مردوں کا دیوتا ہی اکثر کٹائی کا دیوتا ہوتا ہے، جس سے یہ ظاہر ہے کہ زندگی اور موت ایک دوسرے سے اس طور لپٹی ہیں کہ انہیں جدا نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ایک کے بغیر دوسری کو حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ دیوتا جو مرتا ہے اور پھر زندگی پاتا ہے اسی طرح کے آفاقی عمل کی مثالی علامت ہے، جسے ہم موسموں کے باری باری گھٹنے بڑھنے میں دیکھتے ہیں۔ ایک نئی زندگی ممکن ہے، مگر ان مرگ آشنا نباتاتی دیوتاؤں کی دیومالا اور مسلک کی مرکزی خصوصیت یہ ہے کہ تباہی اور خون ریزی دائمی ہے اور حیات آفریں قوتوں کی فتح کبھی مکمل نہیں ہوتی۔

یہ بات اس دیومالا میں بطور خاص واضح ہو جاتی ہے جو میسوپوٹیمائی دیوی عنانا کے زیر زمین چلے جانے کا قصہ بیان کرتی ہے۔ اسے زیر زمین خطوں میں شریک راز بنانے کی اس تقریب کے طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے جو نئی زندگی دینے والی موت کا تجربہ ہوتی ہے۔ جہاں تک ہم اپنے نامکمل ماخذ کی مدد سے بتا سکتے ہیں، اس [عنانا] کا مقصد اپنی بہن اور جہنم کی ملکی عریش کیگل (Ereshkigal) کو ہڑپ کرنا ہے، جو زندگی پر اختیار رکھنے والی بھی ہے۔ عنانا کو عریش کیگل کے لاجوردی محل میں داخل ہونے سے پہلے اپنی بہن کے شہر کی سات دیواروں کے سات دروازوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ عنانا کو ہر مرتبہ دربان چیلنج کرتا ہے اور اسے اپنی پوشاک کا کوئی جز گرانے پر مجبور کرتا ہے، یہاں تک کہ جب عنانا بالآخر اپنی بہن کے حضور پہنچتی ہے تو وہ اپنے دفاع کے تمام ساز و سامان سے تہی ہو چکی ہوتی ہے۔ عنانا کی چال ناکام ہو جاتی ہے، زیر زمین دنیا کے سات منصف اسے موت کی سزا کا حکم سناتے ہیں اور اس کی لاش ایک نوکیلے ڈنڈے پر عام ملاحظے کیلئے لٹکا دی جاتی ہے۔

تاہم عنانا کو دوسرے دیوتا بچا لیتے ہیں، اس کی زمین کی طرف واپسی، جو شیطانوں کے جتھے کے ہمراہ ہوئی ہے، کامیاب اور دہشت ناک ہوتی ہے، جب وہ گھر پہنچتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نوجوان وجیہہ شوہر ڈموزی (Dumuzi) نے اس کے تخت پر براجمان ہونے کی جسارت کی ہے۔ عنانا اسے سزائے موت دیتی ہے، ڈموزی [یہ سن کر] بھاگ کھڑا ہوتا ہے، شیطان اس کا پیچھا کرتے اور اسے زیر زمین دنیا میں عنانا کی جگہ لینے پر مجبور کرتے ہیں، مگر پھر ایک معاہدہ ہو جاتا ہے، جس کے ذریعے سال کی ڈموزی اور اس کی بہن غشتیانا (Geshtinania) میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، دونوں چھ چھ ماہ زیر زمین دنیا میں عریش کیگل کے ساتھ گزارتے ہیں۔ لیکن

عنانا کی مہم کی وجہ سے دنیا ہمیشہ کیلئے بدل جاتی ہے، ڈموزی، جو اب نباتات کا دیوتا ہے، کی غیر موجودگی موسمیاتی تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ جب وہ عنانا کی طرف لوٹتا ہے تو زمین زندہ ہو اٹھتی ہے یعنی بھیڑ کے بچے پیدا ہوتے اور اناج نمودار ہو جاتا ہے۔ اس کے فوراً بعد کٹائی ہونے لگتی ہے۔ جب وہ زیر زمین دنیا میں چلا جاتا ہے تو زمین گرما کی طویل خشک سالی کا شکار ہو جاتی ہے۔ موت پر حتمی فتح نام کی کوئی شے نہیں۔ جس سمیری نظم میں یہ اسطورہ بیان ہوئی ہے، اس پکار پر ختم ہوتی ہے، ''اے عریش کیگل: تیری مدحت عظیم ہے''۔ [۳۷] ذہن میں جو بات پر اثر، دردناک انداز میں اٹک کر رہ جاتی ہے، وہ عورت کا گریہ ہے، خاص طور پر ڈموزی کی ماں کا، جب وہ اپنے بیٹے کے کھو جانے کا ماتم کرتی ہے ''اجڑی جگہ پر درماندہ و تنہا، جہاں وہ کبھی زندہ تھا، اب وہاں ایسے پڑا ہے، جیسے ایک جوان بیل کو زمین پر مار گرایا گیا ہو'۔ [۳۸]

یہ دیوی ماں نجات دہندہ نہیں ہے، بلکہ موت اور رنج کا سبب ہے۔ اس کا سفر ایک شروعات ہے، یعنی قلب ماہیت کی ایک ایسی رسم جس کی ہم سب کو ضرورت ہے۔ عنانا دنیائے مرگ میں اترتی ہے تاکہ اپنی بہن سے مل سکے جو دراصل خود اس کے وجود کا مدفون اور غیر مشتبہ پہلو ہے۔ عریش کیگل مطلق حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے۔ بہت سی اساطیر میں، جو اپنی اصل کے اعتبار سے اس دور سے تعلق رکھتی ہیں، دیوی ماں سے ملاقات ہیرو کی حتمی مہم یعنی عظیم روحانی تنویر کی نمائندگی ہے۔ عریش کیگل بھی، جو زندگی اور موت پر اختیار رکھتی ہے، ایک دیوی ماں ہے، جسے مستقلاً بچے جنم دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ عنانا کو اس تک پہنچنے اور حقیقی بصیرت حاصل کرنے کے لئے اپنے ملبوس کو اتار پھینکنا پڑتا ہے، جو اس کی ضرر پذیری کی حفاظت کیے ہوتا ہے، من و مائی کو منہدم اور اپنے پرانے شعور ذات کو مارنا پڑتا ہے، وہ سب جذب کرنا پڑتا ہے، جو اسے مخالفانہ اور ضرر رساں لگتا ہے اور ناقابل برداشت کو قبول کرنا ہوتا ہے: یعنی موت، ظلمت اور محرومی کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔ [۳۹]

عنانا سے متعلق رسومات اس کی کہانی کے المیہ حصے پر مرتکز ہیں اور موسم بہار میں ڈموزی سے اس کے مکرر ملاپ کی یاد کبھی نہیں منائی گئی۔ چونکہ یہ [عنانا] اس شے کی نمائندگی نہایت پر اثر طریقے سے کرتی تھی، جس کا تجربہ وجود کے بنیادی اصول کے طور پر کہا گیا تھا، اس لیے اس کے مسلک کی اشاعت بڑے پیمانے پر ہوئی۔ اہل بابل نے عنانا کو عشتر (ishtar) کا نام دیا اور شام

www.MashalBooks.org

ہی اسے استراتے (یا اشیرہ) کہا گیا؟ مشرق قریب میں ڈموزی، تموز (Tammuz) کے نام سے معروف ہوا اور اس خطے کی عورتیں اس کی موت پر گریہ کرتی تھیں۔[۴۰] یونان میں اسے ادونس (Adonis) کہا گیا، کیونکہ سامی دنیا کی عورتیں اپنے 'آقا' (ادون) کے کھو جانے پر ماتم کرتی تھیں۔ ادونس کی کہانی ماہ و سال کے پھیر کے ساتھ بدلتی گئی، مگر یہ اپنی اصل شکل میں سمیری اسطوری کی بنیادی ساخت سے مطابقت رکھتی تھی کہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ دیوی اپنے نوجوان شریک حیات کو موت کے سپرد کرتی ہے۔[۴۱] شکاریوں کی عظیم دیوی کی طرح، اواخر حجری دور کی دیوی ماں واضح کرتی ہے کہ اگرچہ مرد زیادہ طاقتور نظر آتے ہیں، تاہم حقیقتاً یہ عورت ہی ہے جو مضبوط ہے اور معاملات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

یہی بات دیمتیر اور اس کی بیٹی پرسی فون (Persephone) کی یونانی اسطورہ سے بھی ظاہر ہے جس کا زمانہ تقریباً یقینی طور پر اواخر حجری دور کا ہے۔[۴۲] دیمتیر مادر اناج ہے جو فصلوں اور زمین کو بے ثمر ہونے سے محفوظ رکھتی ہے۔ جب پاتال کا حکمران ہیڈس (Hades) پرسی فون کو اغوا کر لیتا ہے تو دیمتیر کوہ اولمپس کی سکونت ترک کرتی اور دنیا میں غمزدہ حالت میں ماری ماری پھرتی ہے۔ طیش میں آ کر وہ اس وقت تک کٹائی کا موسم روکے رکھتی ہے اور بنی نوع انسان کو بھوکوں مرنے کا ڈراوا دیتی ہے، جب تک اسے اپنی بیٹی کورے (لڑکی) واپس نہیں مل جاتی۔ زیوس خطرہ بھانپ کر ایک الوہی پیغام پر ہرمیز کو کورے کے بچاؤ کیلئے روانہ کرتا ہے مگر بدقسمتی سے اس نے زیریں دنیا میں اپنے زمانۂ قیام میں کچھ انار دانے کھا لئے ہوتے ہیں، اس لیے وہ ہیڈس کے ساتھ، جو اب اس کا شوہر ہے، سال کے چار ماہ گزارنے کی پابند ہوتی ہے، جب وہ اپنی ماں سے دوبارہ آ کر ملتی ہے تو دیمتیر پابندی اٹھا لیتی ہے اور زمین ایک مرتبہ پھر ثمر ور ہو جاتی ہے۔

یہ فطرت کی ایک سادہ تمثیل نہیں ہے، دیمتیر کی رسوم نہ تو بوائی کے موافق ہیں اور نہ کٹائی کے۔ پرسی فون بیج کی مانند زمین کے اندر جا سکتی ہے، مگر بحیرۂ روم میں بیج کا اکھوا پھوٹنے کیلئے چند ہفتے درکار ہیں، نہ کہ چار ماہ، عنانا کی اسطورہ کی مانند، یہ ایک دیوی کی ایک دوسری کہانی ہے جو غائب ہو جاتی اور پھر ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ موت سے متعلق اسطورہ ہے۔ قدیم یونان میں اناج کی دیوی دیمتیر، مُردوں کی ملکہ بھی ہے اور ایتھنز کے نزدیکی علاقے الیوسس (Eleusis) میں سرّی مذہبی رسوم (mystery cult) کی مقتدر ہستی ہے۔ یہ محض رسوم ہوا کرتی تھیں لیکن یوں لگتا ہے کہ یہ

''مستائی'' (mystai) یعنی نو واردان کو موت کی ناگزیریت کو، زندگی کے ایک لازمی حصے کے طور پر، قبول کرنے پر مجبور کرتی تھیں اور انہیں پتا چلتا تھا کہ موت کی دہشت ختم ہو چکی ہے۔ یہ پر اثر رسومات اس اسطورہ کے معنی کو ان لوگوں کے قلب و ذہن پر نقش کر دیتی تھیں جو ابتدائی تربیت کے اس طویل عمل سے گزرتے تھے۔ موت پر حتمی فتح کا تو کوئی امکان نہیں ہے۔ کورے کو بالائی اور زیریں دنیاؤں میں برابر ادل بدل کرنا پڑتا ہے۔ اس دوشیزہ کی علامتی موت کے بغیر نہ اناج ہو سکتا ہے، نہ خوراک اور نہ زندگی۔

ہم الیوسسی سرّی مذہبی رسوم کے بارے میں بہت تھوڑا جانتے ہیں، مگر جو لوگ ان رسوم میں حصہ لیتے تھے، وہ الجھن میں مبتلا ہو جاتے اگر ان سے دریافت کیا جاتا کہ آیا انہیں یقین تھا کہ برسی فون واقعی زمین کے اندر اسی طرح چلی گئی تھی، جس طرح اسطورہ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ اسطورہ سچی تھی، کیونکہ آپ جہاں بھی نظر ڈالتے، آپ کو نظر آتا کہ زندگی اور موت ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں اور زمین مردہ ہوتی ہے اور پھر جی اٹھتی ہے۔ موت خوفناک، لرزا دینے والی اور ناگزیر تھی، مگر یہ خاتمہ نہیں تھا۔ اگر آپ ایک پودے کو کاٹتے اور مردہ شاخ کو پھینک دیتے تو اس میں نئے شگوفے پھوٹ پڑتے۔ زراعت نے ایک نئی، اگر یہ کہنا موزوں ہو، رجائیت پیدا کی۔ [۴۳] بیج کو مردہ ہونا پڑتا تھا تا کہ وہ اناج پیدا کر سکے، کاٹ چھانٹ حقیقتاً پودوں کے لئے مددگار تھی اور تازہ نمو کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ الیوسس میں ابتدائی تربیت کی رسم سے ظاہر تھا کہ موت کا سامنا کرنے سے روحانی بالیدگی ملتی تھی اور یہ انسانی کانٹ چھانٹ ہی کی ایک صورت تھی۔ اس سے لاقانونیت نہیں ملتی تھی۔ صرف دیوتاؤں کو ہمیشگی حاصل تھی۔ مگر یہ آپ کو اس قابل بناتی تھی کہ آپ بے خوفی سے جی سکیں اور اطمینان کے ساتھ موت کا سامنا کرتے ہوئے زمین پر بھرپور زندگی بسر کر سکیں۔ بلاشبہ ہم ہر روز اس بات پر مجبور ہیں کہ اس شعور ذات کو دم توڑنے دیں جسے ہم نے پہلے حاصل کیا تھا۔ اواخر حجری دور کی تبدیلی حالت کی اساطیر اور رسوم نے بھی لوگوں کو اپنی فنا پذیری یعنی اگلے مرحلے کی طرف منتقل ہونے کو قبول کرنے اور تبدیلی اور بڑھوتری کا حوصلہ پانے میں مدد دی۔

☆☆☆

www.MashalBooks.org

ابتدائی تہذیبیں

(۴۰۰۰ تا ۸۰۰ ق م)

قریباً چار ہزار سال قبل مسیح میں بنی نوع انسان نے ایک اور بڑی پہل قدمی کی جب انہوں نے شہر تعمیر کرنے شروع کیے، پہلے میسوپوٹیمیا اور مصر میں چار ہزار قبل مسیح کے آس پاس اور پھر چین، ہندوستان اور کریٹ میں۔ ان میں سے بعض ابتدائی تہذیبیں ختم ہوگئیں اور ان کے آثار بھی باقی نہیں، مگر زرخیز اسلامی دنیا میں جس میں اب عراق واقع ہے، ہمیں اس دیومالا میں مدنیت کے چیلنج کا اوائلی جواب نظر آتا ہے، جس میں شہری زندگی کی دھوم دھام کا ذکر ہے۔ انسانی زندگی زیادہ خودآگاہ ہوتی جا رہی تھی۔ لوگ اب اپنی آرزوؤں کا مستقل اظہار اپنے تہذیبی فنون میں کر سکتے تھے اور تحریر کی ایجاد کا مطلب تھا کہ وہ اپنی اساطیر کو بقا پذیر ادبی اظہار دے سکتے تھے۔ وہ اب تاریخی عہد میں داخل ہو چکے تھے: شہروں میں تبدیلی کی رفتار بڑھ گئی تھی اور لوگ سبب اور نتیجے کے سلسلے سے زیادہ آگاہ ہو گئے تھے۔ نئی ٹیکنالوجی نے شہر کے باسیوں کو اپنے ماحول پر مزید اختیار دے دیا تھا اور وہ فطری دنیا سے برابر مختلف ہوتے جا رہے تھے۔ یہ ہیجان خیزی، آزادی اور فخر کا موقع تھا۔

لیکن اس پیمانے پر بڑی تبدیلی نے کافی خوف بھی پیدا کیا۔ تاریخ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ انہدام کا عمل ہے، کیونکہ ہر نئی ترقی اس سب کی تباہی کا تقاضا کرتی ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔[۴۴] میسوپوٹیمیائی شہروں کا بالکل یہی معاملہ تھا، جہاں مٹی کی اینٹوں سے بنی عمارتوں کو مسلسل دیکھ بھال اور معینہ وقفوں کے بعد دوبارہ تعمیر کرنے کی ضرورت تھی۔ وہاں اپنے پیش رووں

کے ہموار کئے گئے ملبے کے اوپر نئے ڈھانچے کھڑے کیے گئے اور اس طرح انحطاط اور تجدید کا عمل، شہر کی تعمیر و توسیع کی منصوبہ بندی کے ایک نئے فن میں ڈھل گیا۔[۴۵] تہذیب کا تجربہ ایک پر تکلف تعمیر و آسائش مگر شکستنی شے کے طور پر کیا گیا، ایک شہر اچانک نمودار ہوتا اور ڈرامائی انداز میں پھلتا پھولتا مگر اتنی ہی سرعت کے ساتھ زوال کا شکار ہو جاتا۔ ایک شہری ریاست کو برتری اور اعلیٰ مقام، اپنے حریفوں کو لقمہ تر بنانے کے نتیجے ہی میں ملا۔ اس زمانے میں جنگیں تھیں، قتل و غارت تھی، انقلابات تھے اور آبادی کی بے دخلی تھی۔ تباہی کا مطلب تھا کہ جس کلچر کو اتنی تکالیف اٹھانے کے بعد حاصل کیا گیا تھا، اسے دوبارہ تعمیر کرنے اور بار بار رواج دینے کی ضرورت تھی۔ یہ خوف مستقلاً لاحق رہتا تھا کہ کہیں زندگی قدیمی وحشت کی طرف نہ لوٹ جائے، نئی شہری اساطیر نے، جن میں اندیشے اور امید باہم آمیز تھے، امن و انتشار کے درمیان لامتناہی جدوجہد کو موضوع بنایا۔

اس میں اچنبھا نہیں ہونا چاہیے کہ کچھ لوگوں نے تہذیب کو آفت سمجھا۔ بائبل کے مصنفین نے اسے خدا سے جدائی کی علامت سمجھا کہ جس کے بعد عدن سے [آدم کی] بے دخلی ہوئی۔ شہری زندگی خود اپنے آپ میں متشدد لگتی تھی، جس میں قتل اور استحصال لازمی طور پر موجود تھے۔ قابیل (Cain) نامی جس شخص نے پہلا شہر تعمیر کیا، پہلا قاتل تھا،[۴۶] اس کی آل اولاد نے مہذب فنون ایجاد کیے۔ جوبال (Jubal) ان سب کا جد تھا، جنہوں نے بربط (Lyre) اور باجے (Pipos) بجائے اور توبال کین (Tubaclain) نے کانسی اور لوہے کے ہر قسم کے آلات بنائے۔[۴۷] بابل کے عظیم ستونوں والے معبد (Ziggust) یا مندر کے مینار نے قدیم اسرائیلیوں پر گہرا اور مخاصمانہ تاثر مرتب کیا۔ یوں لگتا ہے کہ مادہ پرستوں کی دیوتاؤں کی نافرمانی کا جوہر یہ تھا کہ یہ صرف و محض خود پرستی کی آرزو سے تحریک پاتی تھی۔ وہ اسے باول یا بابل کا مینار کہتے تھے، کیونکہ خدا نے معماروں کو سزا دینے کیلئے تمام زمینی مخلوق کی زبان کو چکرا دیا اور وہاں سے انہیں پوری زمین پر منتشر کر دیا۔[۴۸]

تاہم میسوپوٹیمیا کے لوگوں نے خود شہر کو ایک ایسا مقام سمجھا جہاں وہ الوہیت کا سامنا کر سکتے تھے۔ یہ جنت گم گشتہ کی تقریباً تخلیق نو تھی۔ قدیم عراق کا ستونوں والا معبد پہاڑ کا متبادل تھا، جو دنیا کے قلب میں تھا، اس نے ابتدائی انسانوں کو اس قابل بنایا کہ وہ دیوتاؤں کی دنیا تک رسائی حاصل کر سکیں، دیوتا شہروں میں رہتے تھے، ان مندروں میں مردوں اور عورتوں کے پہلو بہ پہلو جو الوہی دنیا کے ان کے محلات کی نقل تھے، قدیم دنیا میں ہر شہر ایک مقدس شہر تھا۔ شہروں کے یہ

www.MashalBooks.org

ابتدائی باسی اپنے ثقافتی فاصلات کو اسی طرح اصلاً الوہی سمجھتے تھے، جس طرح ان کے آباؤ اجداد نے شکار اور کاشتکاری کو مقدس اور میثاق پر مبنی سرگرمیاں خیال کیا تھا۔ میسوپوٹیمیا میں دیوتاؤں نے آدمیوں کو تعلیم دی کہ معبد کیسے تعمیر کرتے ہیں اور دانائی کی دیوی انکی (Enki)، چرمی مردوں، دھات کے فن کاروں، حجاموں، معماروں، ظروف سازوں، آب پاشی کے تکنیک کاروں، طبیبوں موسیقاروں اور مقالہ نویسوں کی سرپرست تھی۔[۴۹] انہیں معلوم تھا کہ انہوں نے ایک حیران کن کام ہاتھ میں لیا ہے جو انسانی زندگی کو ہمیشہ کیلئے بدل کے رکھ دے گا، ان کے شہر ماورائی تھے، کیونکہ وہ ہر اس شے کو عبور کر گئے تھے جو پہلے معلوم تھی، وہ دیوتاؤں کی الوہی تخلیقیت میں شریک تھے۔ جنہوں نے ایک طرح سے انتشار کی بدنظمی ہی سے تنظیم کو جنم دیا تھا۔

لیکن اسرائیلیوں نے یہ غلط تصور کیا تھا کہ میسوپوٹیمیا کے لوگ دیوتاؤں کی نافرمانی کے مجرم تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی، خواہ وہ ان کے زبردست شہروں ہی کی کیوں نہ ہو، دیوتاؤں کی اس دنیا کے مقابلے میں ناقص اور عارضی تھی، جو اب بھی ان کی روزمرہ دنیا کے پس منظر میں موجود تھی۔ ان کے شہر دلمون (Dilmun) کی اس جنت گم گشتہ کا محض زرد سایہ تھے، جس میں فقط دیوتا آباد تھے اور چند خاص الخاص انسان۔ وہ اس بات کی آگاہی رکھتے تھے کہ خود انسانی زندگی کی طرح تہذیب شکستنی اور غیر مستقل ہے۔ مصر جو ایک گٹھا ہوا ملک تھا، پہاڑوں کی وجہ سے الگ تھلگ اور مخالفانہ قوتوں سے محفوظ تھا اور جس کی مٹی نیل کے باقاعدہ سیلاب سے زرخیز تھی، وہاں انسانی کامیابیوں پر بہت زیادہ اعتماد تھا، لیکن میسوپوٹیمیا میں زندگی خاصی غیر محفوظ تھی، کیونکہ دجلہ اور فرات کے سیلاب کے بارے میں پیش گوئی نہیں کی جاسکتی تھی اور یہ اکثر تباہ کن ہوتا تھا، اسی طرح موسلا دھار بارش زمین کو دلدل میں بدل دیتی تھی یا جھلسا دینے والی ہوائیں اسے [زمین] غبار میں تبدیل کر دیتی تھیں۔ تہذیب کا قیام، فطرت کی سرکش اور تباہ کن قوتوں کے خلاف سورمائی کوششوں کا متقاضی تھا۔ یہی خوف ان کی سیلاب سے متعلق اساطیر میں خاص طور پر ظاہر ہوئے ہیں۔ میسوپوٹیمیا کے دریاؤں میں اپنی سمت اچانک بدل لینے کا میلان ہے، کیونکہ ان کے راستے میں کوئی فطری رکاوٹیں نہیں، اس وجہ سے سیلاب کثرت سے آتے تھے اور اکثر آفت ثابت ہوتے تھے۔ مصر کی طرح یہاں سیلاب رحمت نہیں تھا بلکہ سیاسی اور سماجی خاتمے کا استعارہ بن گیا۔

لوگ جب تاریخ کے ایک نئے عہد میں داخل ہوتے، انسانیت اور الوہیت دونوں کے

بارے میں اپنے خیالات تبدیل کر لیتے۔ ان ابتدائی تہذیبوں میں مرد اور عورت ہم جدیدیوں کی طرح ہوتے جا رہے تھے، یعنی پہلے سے کہیں زیادہ آگاہ ہوتے جا رہے تھے کہ وہ اپنی تقدیر کے خود مالک ہیں، نتیجتاً وہ اس طرح سے دیوتاؤں کو اب نہیں دیکھ سکتے تھے، جس طرح ان کے آباؤ اجداد نے دیکھا تھا، چونکہ اب انسانی اعمال کو مرکزیت حاصل ہوگئی تھی، اس لئے دیوتا مزید بعید لگتے تھے، اب وہ ایسی حقیقت نہیں تھے جو خود آشکار تھی اور پہنچ سے دور تھی۔ نئی مدنی اساطیر میں سیلاب، الوہی و انسانی رشتوں میں بحران کی نشاندہی کرتا تھا۔ میسوپوٹیمیا کی سیلاب سے متعلق نظموں میں اترا ہیسس (Atrahasis) سب سے طویل ہے، اس میں دیوتا مردوں کی طرح شہر کی منصوبہ بندی کرنے والے ہیں، کم تر درجے کے دیوی دیوتا، دیہی علاقوں کو آباد کرنے کیلئے آب پاش نہروں کی کھدائی کی بے کراں مزدوری سے تھک ہار کر ہڑتال کرتے ہیں۔ لہٰذا دیوی ماں ان کی جگہ ان معمولی کاموں کو انجام دینے کیلئے بنی نوع انسان کو تخلیق کرتی ہے۔ لیکن وہ تعداد میں اس قدر زیادہ ہو جاتے اور اودھم مچاتے ہیں کہ طغیانی کا دیوتا انلل (Enlil) جو شور وغل کی وجہ سے بیدار رہتا ہے، دنیا کو سیلاب میں غرق کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، جو ایک طرح سے آبادی پر قابو پانے کا وحشیانہ طریقہ ہے، مگر انکی اترا ہیسس کو بچانا چاہتی ہے جو شوروپک (Shuruppak) کے شہر کا 'انتہائی عقل مند آدمی' ہے۔[۵۰] دونوں خاص دوست بن جاتے ہیں، اس لیے انکی، اترا ہیسس کو کشتی بنانے کا کہتی ہے، نیز اسے ایک ایسی ٹیکنالوجی کی تعلیم دیتی ہے جو کشتی کو جل کسی (Watertight) بنا کے رکھتی ہے چنانچہ اس الوہی مداخلت کی وجہ سے اترا ہیسس، نوح کی طرح اپنے خاندان اور تمام زندہ اشیاء کے بیجوں کو بچانے میں کامیاب ہوتا ہے، لیکن پانی اترنے کے بعد دیوتا تباہ کاری سے دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ انکی، اترا ہیسس اور اس کی بیوی کو دلمون لے جاتی ہے۔ صرف یہی انسان ہوں گے جو لافانیت اور دیوتاؤں سے قدیمی یگانگت کا لطف اٹھائیں گے۔ تاہم یہ کہانی اس وہبی طور پر حاصل ہونے والی ٹیکنالوجی کا دھوم دھام سے بیان کرتی ہے، جس نے نسل انسانی کو ختم ہونے سے بچایا، ہمارے جدید عہد کی طرح میسوپوٹیمیا میں تیزی کے ساتھ تہذیب اور ثقافت، دیومالا اور امنگوں کا مرکز بنتی گئیں۔

تاہم میسوپوٹیمیا کے لوگ پوری طرح ہمارے جیسے نہیں تھے۔ دیوتاؤں سے منہ موڑا جا سکتا تھا مگر لوگ اپنی روزمرہ سرگرمیوں میں ماورائی عنصر سے انتہائی آگاہ رہتے تھے۔ ہر ایک شہر کو کسی ایک

دیوتا کی سلطنت سمجھا جاتا تھا اور ہر ایک شہری، خواہ وہ حکمران ہو یا کوئی عاجز دست کار، انلل، انکی یا عنانا جیسی سرپرست دیوی کی خدمت پر مامور ہوتا۔[۵۱] لوگ ابھی تک اس سدا بہار فلسفے سے وابستگی رکھتے تھے جو زمین پر موجود ہر شے کو سماوی حقیقت کا ثنیٰ قرار دیتا تھا۔ بڑی عمر کے لوگوں کی ایک جماعت شہری ریاستوں پر حکومت کرتی تھی، لہٰذا میسوپوٹیمیا کے لوگوں کا اعتقاد تھا کہ ممتاز دیوی دیوتاؤں کی الوہی جماعت، دیوتاؤں [کی قلمرو] پر حکمرانی کرتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی باور کر رکھا تھا کہ دیوتاؤں کے ارتقاء کا قصہ، ان کی شہری ثقافت کے ارتقاء سے ملتا جلتا تھا، جوان چھوٹے زراعت پیشہ گروہوں کا نتیجہ تھا جنہوں نے دیہات کے فطری آہنگ کو جذب کیا ہوا تھا۔

تخلیق سے متعلق اس اسطور کے وجود میں آنے کا قصہ یہی ہے، جو بابل کی رزمیہ نظم میں محفوظ ہو گئی ہے، اپنے تمہیدی الفاظ کی نسبت سے اس نظم کا عنوان انوما ایلش (Enuma Elish) ہے۔ ہمیں دستیاب متن کا زمانہ قبل مسیح کے دوسرے ہزاریے کا پہلا نصف ہے، تاہم اس میں کافی قدیم مواد شامل ہے۔[۵۲] نظم کا آغاز دیوتاؤں کے نسب نامے سے ہوتا ہے جو اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ اول اول خود دیوتا کیسے وجود میں آئے۔ کوئی ایسی تخلیق نہیں جو لاموجود سے وجود میں آئی ہو۔ ہر تخلیق ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے، جس کے مطابق اولین دیوی دیوتا اس مقدس اولین مادے، ایک بے ترتیب، بے ہیبت، غیر واضح جوہر سے ظاہر ہوئے جس میں ہر شے شناخت سے محروم تھی۔ نمک اور کڑوا پانی ایک دوسرے میں گڈ مڈ تھے، آسمان، زمین یا سمندر میں کوئی علیحدگی نہیں تھی اور خود دیوتا ''بے نام، بے فطرت، بغیر مستقبل'' کے تھے۔[۵۳] دلدل سے نمودار ہونے والے دیوی دیوتا کو عناصر سے جدا کرنا ممکن نہیں تھا۔ ایسو میٹھا دریائی پانی تھا، تیامت نمکین سمندر تھی اور مومو گہر آلود بادل تھا۔ ان کے ناموں کے یہ ترجمے کیے جا سکتے ہیں: واتھا گھاٹی، خلا اور بے پیندے کا گڑھا۔

یہ اولین دیوی دیوتا ابھی تک بے شکل اور بے عمل تھے۔ لیکن ان سے دوسرے دیوتا جوڑوں میں برآمد ہوئے ہیں اور ہر جوڑا آخری کی نسبت واضح ناک نقشہ رکھتا ہے۔ جوں ہی یہ الوہی عناصر ایک دوسرے سے الگ ہوئے ہیں، منظّم کون و مکاں وجود میں آ جاتے ہیں۔ سب سے پہلے رسوب (پانی اور مٹی کا آمیزہ) ظاہر ہوا، جس کی نمائندگی لاہمو (Lahmu) اور لہامو (Lahamu) کرتے ہیں۔ پھر انشر اور بشر (آسمان اور سمندر کے افق) اور آخر میں آسمانی دیوتا انو

(Anu) اور ای آ (Ea) یعنی زمین نمودار ہوئے۔ بایں ہم دیوتاؤں کے نسب نامے سے متعلق یہ اسطورہ، الوہیت کے ارتقاء سے متعلق مابعد الطبیعیاتی قیاس نہیں ہے، یہ قطعی طور پر میسوپوٹیمیا کے بارے میں غور و تامل بھی ہے، جو پانی ملی ریت کے ڈھیر پر وجود میں آنے والا زرخیز سیلابی مٹی کا علاقہ ہے۔ علاوہ بریں الوہیت انسانی دنیا کا ایک پہلو ہے۔ دیوتاؤں کو قدرتی مناظر سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ اریدو (Eridu) میں، جو میسوپوٹیمیا کے قدیم شہروں میں سے ایک ہے، جس دلدلی میٹھے پانی کے چشمے نے وہاں آبادی کو ممکن بنایا تھا اور جس نے مرکز عبادات کو گھیرا ہوا تھا، اسے ہی اسپو کا نام دیا گیا۔ یہ اسطورہ فطرت سے بتدریج علیحدگی کا بیان بھی کرتی ہے، جس کا تجربہ خود شہر کے باسی کر رہے تھے۔

نئے دیوتا زیادہ فعال تھے اور وہ اب اپنے والدین پر غلبہ پانے کے قابل تھے: اسپو زمین کے اندر چلا جاتا ہے اور ای آ اور انو اپنی ہی ہڈیوں پر خود اپنے محل تعمیر کرتے ہیں جو استفعی گرجا اور کونسل ہال سے مزین ہوتے ہیں۔ شہر کی عمارتیں، میسوپوٹیمیائی کونیات عروجی لمحات کی نشاندہی کرتی تھیں۔ تاہم تیامت اب بھی گھات لگائے ہوئے خطرہ تھی، جس نے اسپو سے انتقام لینے کے لئے عفرتیوں کا زبردست جتھہ تخلیق کر رکھا تھا۔ اس مخصوص لڑائی میں اسے اگر کوئی دیوتا مات دے سکتا تھا تو وہ ای آ کا زبردست بیٹا مردوک (Marduk) تھا۔ ایک گمبھیر جدوجہد کے بعد مردوک تیامت کی بھاری بھرکم لاش پر کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک بڑے سمندری کیکڑے کی طرح اسے دو حصوں میں تقسیم کر ڈالتا ہے، تاکہ آسمان کو تخلیق کر سکے اور زمین کو جہاں انسان آباد ہو سکیں۔ وہ نئے کونیاتی نظم کو مستحکم کرنے کیلئے قوانین نافذ کرتا اور ایک الوہی جماعت (اسمبلی) قائم کرتا ہے۔ آخر میں، پس اندیشی کے طور پر مردوک، ایک شکست خوردہ دیوتا کے خون کو مٹھی بھر غبار میں ملا کر پہلے انسان کی تخلیق کرتا ہے، یہ بتانے کیلئے کہ دیوتا خود اپنی مافوق الفطرت سلطنت میں محصور نہیں ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت اور فطری دنیا یکساں الوہی مادے سے بنی ہیں۔

یہ اسطورہ تبدیلی کے اس انسانی عمل کا جائزہ لیتی ہے جو دیوتاؤں کے ارتقاء کے مماثل ہے۔ یہ میسوپوٹیمیا ان شہری ریاستوں کے ارتقاء کی عکاسی کرتی ہے، جنہوں نے قدیم زرعی معاشرت کی طرف پیٹھ کر لی تھی (اس معاشرت کو غیر ترقی یافتہ اور کاہل سمجھا جانے لگا تھا) اور جس نے خود کو عسکری قوت سے قائم کیا تھا۔ مردوک نے فتح حاصل کرنے کے بعد بابل کی بنیاد رکھی تھی۔

شہر کے عین قلب میں ازا گیلا (Esagila) کا ستونوں والا معبد ہے، جو الوہی دنیا میں مردوک کی خانقاہ کی نقل ہے۔ دیگر تمام عمارات سے قد نکالتا ہوا، بے کراں آسمان کی علامت، کے طور پر یہ دیوتاؤں کا ارضی گھر ہے، اس شہر کو ''باب لدنی'' (دیوتاؤں کا دروازہ) کہا گیا ہے، یعنی ایسا مقام جہاں الوہی ہستی، انسانوں کی دنیا میں داخل ہوتی ہے۔ ازا گیلا میں دیوتا مقدس با جماعت رسم عبادت کے لئے تشریف فرما ہوتے ہیں، اسی سے کائنات کو اپنی ساخت حاصل ہوتی ہے، مخفی دنیا کے خدوخال واضح ہوئے ہیں اور دیوتاؤں کو کائنات میں ان کا مقام و مرتبہ تفویض کیا جاتا ہے۔[۵۴] اس طور شہر اس قدیم خیالی خط کی جگہ لے سکتا تھا، جس نے عہد زریں میں آسمان اور زمین کو باہم منسلک کر رکھا تھا۔

بائبل میں بھی تخلیق سے متعلق اساطیر محفوظ ہیں جو بتاتی ہیں کہ یہواہ نے قیامت جیسی سمندری عفریت کو مارنے کے بعد دنیا پیدا کی۔[۵۵] اس قسم کی کونیات مشرق وسطیٰ کے لوگوں میں مقبول تھی۔ اس میں ان لوگوں کے اس عقیدے کا اظہار کیا گیا تھا کہ تہذیب ایک جاری جدوجہد تھی، غلبہ آخری مشکلات کے خلاف ایک زبردست کوشش تھی تا کہ بے ہیئت وحشت کی طرف مراجعت کو روکا جا سکے۔ انوما ایلش (Enuma Elish) کو نئے سال کے جشن کے چوتھے روز باہم مل کر لہک کر گایا جاتا تھا۔ کسی بھی اساطیری بیانیے کی مانند یہ نظم اس پراسرار اور ناگفتنی واقعے کو پیش کرتی تھی جو جملہ آفات (Every Ishen) کے مقدس زماں میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ یہ ایک عام تاریخی وقوعے کی مانند نہیں تھا جو (شروع ہوتا اور) اچھی طرح اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔ دنیا کی تخلیق ایک مسلسل عمل تھا، انتشار کے خلاف الوہی جنگ جاری رہتی تھی اور بنی نوع انسان کو الوہی قوتوں کی آمد کی حاجت تھی جو بدنظمی اور آفت کو روکے رکھتی تھی۔

قدیم دنیا میں علامت کو اپنے نادیدہ مصداق سے جدا کرنا ممکن نہیں تھا چونکہ مشابہت ایک قسم کی شناخت کے مترادف ہوتی ہے، اس لئے علامت نادیدہ حقیقت کو محسوس بناتی ہے۔ ڈراما سال نو کے جشن کی علامتی رسم تھا، جو کسی بھی اچھے تمثیلی واقعے کی طرح زمان اور مکاں کی بندشوں کا خاتمہ کرتا تھا اور ناظرین اور ڈرامے کے شرکا کو ان کے دنیوی مشاغل سے دور لے جاتا تھا۔ یہ ایک مقدس مغالطے کا کھیل تھا۔ پجاریوں کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس لازمانی الوہی قلمرو میں جا پہنچے ہیں جو ان کی روزمرہ زندگیوں کا پس منظر تشکیل دیتی ہے۔ ناتواں قریب المرگ سال کو منسوخ

کرنے کی غرض سے قربانی کا بکرا ذبح کیا جاتا، ایک مصنوعی جنگ شروع کی جاتی جو مردوک کی قیامت کے خلاف جدوجہد کی نمائندگی کرتی اور رنگ رلیاں منائی جاتیں جو انتشار کی قوتوں کو دوبارہ پیدا کرتیں، ان میں حکمران کو ذلیل وخفیف کرنا اور اس کی جگہ تہوار میں دادِ عیش دیتے بادشاہ کو تخت نشین کرنا شامل ہوتا۔ یہ [حکمران کی] رسمیاتی برخاستگی ہمیں شمن کی نفسیاتی شکست وریخت کی یاد دلاتی ہے، جس سے وہ اپنی ابتدائی تربیت کے دوران میں گزرتا، نیز حالت کی تبدیلی کی رسوم کی طرف محتاط طور پر منظّم ومرتب کی گئی مراجعت کی طرف دھیان لے جاتی ہے۔ زمانہ عتیق کی روحانیت میں اولین انتشار کی طرف علامتی واپسی، نئی تخلیق کیلئے ناگزیر ہے۔[۵۶]

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے آفرینش سے متعلق دیومالا نے کبھی زندگی کی اصل سے متعلق واقعاتی معلومات مہیا نہیں کیں۔ قدیم دنیا میں آفرینش عالم (کی کہانی) کی قرأت عموماً باجماعت پرستش کے ماحول میں اور ناموافق حالات کے دوران میں کی جاتی، جب لوگ الوہی قوت کے انجذاب کی ضرورت محسوس کرتے، جب وہ کسی نئی قسمت آزمائی کے، مثلاً نئے سال، شادی یا جشن تاج پوشی، آغاز ہی میں نامعلوم کی تحقیق کر رہے ہوتے۔ اس کا مقصد معلومات کی فراہمی نہیں، بلکہ بنیادی طور پر مصالحانہ تھا۔ جب لوگ سر پر کھڑی آفت کا سامنا کرتے، کسی منافقشے کو انجام تک پہنچانا یا مریض کی شفاء چاہتے تو آفرینش عالم کی اسطورہ کی قرات سنتے۔ خیال تھا کہ ان لازمانی قوتوں کو کام میں لایا جائے تو انسانی وجود کے لئے سازگار تھیں۔ اسطورہ اور اس سے وابستہ رسوم اس امر کی یاد دہانی کراتی تھیں کہ اکثر چیزیں، اس سے پہلے کہ بہتر صورت اختیار کریں، خرابی سے دوچار ہوئی ہیں، نیز بقاء اور تخلیقیت کو مخلصانہ جدوجہد درکار ہے۔

دیگر کونیات اس بات کی نشاندہی کرتی تھیں کہ سچی تخلیقیت ذاتی مفادات کی قربانی کا مطالعہ کرتی ہے۔ وہ ویدک کہ عہد کی ہندوستانی اساطیر کے مطابق تخلیق اپنی جاں نثار کرنے کے عمل کا ثمر تھی۔ پوروشا (پُرش Purusha) جو ایک کائناتی دیو تھا، اس نے خود اپنے باپ کو دیوتاؤں کے حضور پیش کیا۔ جنہوں نے اسے قربان کیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے، اسی کے جسم سے کائنات اور سماجی طبقات جن سے انسانی معاشرہ عبارت ہے، وجود میں آئے اور اسی بنا پر مقدس اور مطلق تھے۔ چین میں ایک دوسرے دیو، جسے پن گو (Pan Gu) کہا گیا، کے بارے میں ایک مقبول عام اسطورہ تھی؟ اس نے چھتیس ہزار برس تک محنت کی، تب کہیں جا کر نمو پذیر کائنات وجود

میں آئی۔ جاں توڑ محنت کے نتیجے میں وہ بالآخر جان ہار گیا۔ یہی موقف [کہانی کا حاوی خیال] مشرق وسطیٰ کی مبارزت کی اساطیر میں موجود ہے۔ قیامت، موت اور لیویاتھن بدی نہیں ہیں بلکہ محض اپنا کائنات کردار ادا کرتی ہیں۔ انتشار ہی سے ایک منظّم کائنات کے نمودار ہونے سے پہلے انہیں ٹوٹ پھوٹ کو سہنا اور مرنا پڑتا ہے۔ زندہ بچ رہنے اور مہذب معاشرے کا انحصار موت اور دوسروں کی تباہی پر ہے اور نہ ہی دیوتا اور نہ آدمی اس وقت تک حقیقی طور پر تخلیقی ہو سکتے ہیں جب تک وہ خود اپنے آپ کو ترک کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔

اب تک اساطیر دیوتاؤں یا قدیمی زمانے کے آرکی ٹائپی اجداد کے اولین کارناموں اور مساعی پر مکمل طور پر مرکوز تھیں۔ لیکن مدنی اساطیر نے تاریخی دنیا پر اثر انداز ہونے کا آغاز کیا۔ چونکہ اب انسانی قوت اختراع پر زیادہ انحصار کیا جانے لگا تھا، اس لئے لوگوں نے اپنے آپ کو خود مختار عامل سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی اپنی سرگرمیاں پیش منظر ہی آ گئی تھیں اور دیوتا مسلسل دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ شاعروں نے پرانی کہانیوں کی تعبیر نو شروع کر دی تھی۔ ہم اس تبدیلی کو اس بابلی نظم میں دیکھ سکتے ہیں جو ''گل گامش کا رزمیہ'' کے نام سے معروف ہے۔ گل گامش غالباً ایک تاریخی شخصیت تھا، جس کا زمانہ حیات ۲۰۰ ق م تھا، اسے تاریخی دستاویزات میں جنوبی میسو پوٹیمیا کے شہر عروق کے پانچویں بادشاہ کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ بعد ازاں گل گامش لوک ہیرو بن گیا۔ ابتدائی داستانوں میں اسے اپنے خدمت گار انکیدو کے ساتھ مہمات میں مصروف بتایا گیا ہے۔ ان مہمات میں سورماؤں اور دشمن کے مخصوص کارنامے شامل ہیں، جیسے عفریتوں سے بھڑنا، پاتال میں جا پہنچنا اور دیویوں سے بات چیت کرنا، بعد ازاں یہ کہانیاں گہرے معانی کی حامل بن گئیں اور ابدی زندگی کی جستجو قرار پائیں، تاہم اس نظم کا حتمی متن جو ۱۳۰۰ ق م میں لکھا گیا، انسانی ثقافت کے حدود اور معنی کی تلاش سے عبارت ہے۔

نظم کے آغاز میں، گل گامش ایک ایسا آدمی دکھائی دیتا ہے جو اپنے راستے سے بھٹک چکا ہے، اس کے دل میں ایک طوفان مچا ہے اور اس نے اپنے لوگوں کو دہشت زدہ کرنا شروع کر دیا ہے جو تلافی کے لئے دیوتاؤں سے التجا کرتے ہیں، مگر معنی خیز طور پر دیوتا اب انسانی معاملات میں مداخلت پر تیار نہیں اور اس کی بجائے ثالثی کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ [دیوتا] گل گامش کو نبرد آزما ہونے کیلئے کوئی غیر معمولی چیز دینے کی غرض سے انکیدو کو تخلیق کرتے ہیں، جو ایک جنگلی، وحشی

انسان ہے اور دیہی علاقوں میں وحشت زدہ ہو کر بھاگتا ہے انکیدو کا جسم ایک جھبرا اونی کھال ہے، اس کے بے ترتیب الجھے بال ہیں، وہ ننگا ہے، گھاس کھا رہا اور تالاب کا پانی پی رہا ہے، اس طور انکیدو ''ایک ایسا آدمی ہے جیسا وہ ابتداء میں تھا''۔[۵۷] جو انسانوں کے بجائے جانوروں سے زیادہ مانوس ہے۔ انکیدو کو اطاعت شعار بنانے کے لئے گل گامش شمہت (Shamhat) نام کی کسبی کو بھیجتا ہے تاکہ اسے وہ مہذب اطوار سکھائے۔ شمہت کے ساتھ چھ راتیں بسر کرنے کے بعد انکیدو کو پتہ چلتا ہے کہ اس کا فطری، حیوانی دنیا سے تعلق ٹوٹ چکا ہے۔ وہ مہذب بن چکا ہے، جس کا مطلب ہے کہ اس نے کچھ کھو دیا اور کچھ پا لیا ہے۔ انکیدو 'تخفیف شدہ' ہو چکا ہے، مگر ساتھ ہی وہ 'عمیق' اور 'دیوتائی مثل' بن چکا ہے۔[۵۸] اس نے دانش اور لطافت احساس حاصل کر لی ہے، جو اسے عروق کے نفیس طرز حیات سے استفادہ کرنے کیلئے قابل بنائے گی اور یہ انسانیت کی فطری حالت سے اس قدر بعید ہے کہ الوہی معلوم ہوتا ہے۔

گل گامش اور انکیدو دوست بن جاتے ہیں اور اپنی مہمات پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ بھٹکتے، مارے مارے پھرتے ان کی ملاقات اشتر سے ہوئی ہے۔ پرانی اساطیر میں دیوی ماں سے شادی اعلیٰ ترین روشن خیالی اور ہیرو کی جستجو کے نقطہ عروج کی نمائندگی کرتی تھی، مگر گل گامش اشتر کو نامنظور کر دیتا ہے۔ یہ اس روایتی اساطیر کی زوردار تنقید ہے، جو شہری مردوں اور عورتوں سے اب پوری طرح ہم کلام نہیں ہوتیں۔ گل گامش تہذیب کو ایک الوہی کارروائی کے طور پر نہیں دیکھتا۔ اشتر ثقافت کو برباد کرنے والی ہے۔ وہ ایک آبی مشک کی طرح ہے جو اپنے ہی باردار کو تتر بتر کر دیتی ہے، ایک ایسے جوتے کی مانند ہے جو اپنے پہننے والے کو چبھتا ہے اور ایک ایسے دروازے کی صورت ہے جو ہوا کو باہر نہیں روکتا۔[۵۹] اس کی ناتے داریوں میں سے کسی کو ثبات حاصل نہیں ہوتا، وہ اپنے عاشقوں میں سے ہر ایک کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔[۶۰] فانی انسان غیر ذمہ دار دیوتاؤں سے ان تباہ کن حریفانہ مقابلوں کے بغیر ہی بھلے، گل گامش، جو ایک تہذیب یافتہ شخص ہے، الوہیت سے اپنی آزادی کا اعلان کرتا ہے۔ دیوتاؤں اور انسانوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ اپنے الگ راستوں پر ہو لیں۔

اشتر اپنا انتقام لیتی ہے، انکیدو بیمار پڑتا اور مر جاتا ہے۔ گل گامش خوف و فکر سے بولا جاتا ہے، اس آگاہی کے بوجھ تلے دبا کہ اسے بھی بالضرور مرنا ہے، وہ یاد کرتا ہے کہ سیلاب عظیم میں بچ

www.MashalBooks.org

رہنے والے کو (جسے اس نظم میں اتنا پشتم کہا گیا ہے) ابدی زندگی عطا کی گئی ہے، چنانچہ وہ دلمون میں اس سے ملاقات کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ مگر بنی نوع انسان عہد عتیق کی روحانیت کی طرف نہیں لوٹ سکتے، لہٰذا دیوتاؤں کی دنیا کی یہ تلاش ثقافتی مراجعت کی نمائندگی کرتی ہے۔ گل گامش بڑھی ہوئی ڈاڑھی، بے ترتیب الجھے بالوں اور فقط شیر کی کھال پہنے، گھاس کے وسیع میدانوں میں مارا مارا پھرتا ہے، شمن کی طرح وہ آباد زمینوں میں سورج کے راستے پر چلتا ہے، اس کے پاس زیر زمین دنیا کی بصیرت ہے اور اسے ''دیوتاؤں کے بھید بھرے علم'' کی تلاش ہے۔ [۶۱] بالآخر جب وہ دلمون پہنچتا ہے تو اتنا پشتم اس پر واضح کرتا ہے کہ دیوتا اب خصوصی مراعات یافتہ انسانوں کے لئے قوانین فطرت معطل نہیں کریں ے۔ پرانی اساطیر اب انسانی آرزوؤں کی راہنمائی نہیں کر سکتیں۔ دلمون سے ملاقات پرانے اساطیر طریق کار کو الٹ دیتی ہے۔ [۶۲] اترا ہیسس میں سیلاب کی کہانی کو دیوتاؤں کے نقطہ نظر سے بیان کیا گیا تھا، مگر یہاں اتنا پشتم اپنے ہی تجربے، کشتی کھینے کی عملی مشکلات اور سیلاب کی لائی ہوئی تباہی کے سلسلے میں انسانی ردعمل پر غور کرتا ہے جہاں پرانی اساطیر مقدس دنیا پر مرتکز تھیں اور دینوی واقعات وشخصیات سے زیادہ متعلق نہیں تھیں، وہاں تاریخی شخص گل گامش، اساطیر اتنا پشتم سے ملنے جاتا ہے، تاریخ نے اساطیر پر اثر انداز ہوتا شروع کر دیا تھا، بالکل اسی طرح جیسے دیوتاؤں ے انسانی دنیا سے واپسی کا سفر شروع کیا تھا۔ [۶۳]

گل گامش کو دیوتاؤں سے خصوصی معلومات کے بجائے انسانیت کی حدود سے متعلق تکلیف دہ سبق ملتا ہے۔ وہ اپنا رخ واپس تہذیب کی طرف کرتا ہے، غسل کرتا ہے، شیر کی کھال اتار پھینکتا ہے، بال سنوارتا ہے اور صاف ستھرا لباس زیب تن کرتا ہے۔ اس لمحے کے بعد وہ عروق کی دیواریں تعمیر کرے گا اور مہذب فنون کی پرداخت کرے گا۔ اسے شخصی طور پر موت آجائے گی، مگر اس کی ابدیت [کی نشانی] یہ یادگاریں ہوں گی، خاص طور پر تحریر کی ایجاد، جو اس کی کامرانیوں کو بعد آنے والے لوگوں کیلئے محفوظ کر لے گی۔ [۶۴] جہاں اتنا پشتم دیوتا سے ہم کلام ہو کر عقل مند بن گیا تھا، وہاں گل گامش نے الوہی حمایت کے بغیر خود اپنے تجربے پر تفکر کرنا سیکھا۔ اس نے کچھ واہموں کو کھو دیا مگر ''مکمل دانائی'' حاصل کر لی، جب وہ '[تھکا ہارا، عاجز لوٹا مگر بالآخر راضی برضا تھا''۔ [۶۵] وہ قدیم اساطیری کشف سے منقطع ہو گیا، پر تاریخ کے پاس دل جوئی وطمانیت کی اپنی ہی صورتیں ہیں۔

یونان میں پرانے اساطیری آدرشوں کی ملتے جلتے انداز میں از سر نو جانچ کی گئی۔ مثال کے طور پر ادونس کی اسطورہ، دموزی اور اشتر کی کہانی کی تشکیل نو سے عبارت ہے اور یہ کہانی ادونس کو ایک سیاسی اسطورہ میں تبدیل کرتی ہے۔ [۶۶] ادونس شہری بننے کے ناقابل ہے۔ ایک پرامید شکاری کے طور پر وہ ان تربیتی رسوم میں ناکام ہوتا ہے جن سے گزر کر یونانی بالغ نوجوان شہری بنتے ہیں اور جو اکثر شکاری آزمائشوں سے متعلق ہوتی تھیں۔ دو دیویوں میں جکڑے ہونے کی وجہ سے وہ کبھی عورتوں کی دنیا سے الگ نہیں ہوتا، یونانی شہری خاندان کے ذریعے مدنی زندگی سے وابستہ تھے، جب کہ ادونس محرمات سے جنسی تعلق کی پیداوار تھا، ایک ایسا عمل تھا جو خاندانی آدرش کو بگاڑتا اور اس سے انحراف کرتا تھا۔ اسی لیے ادونس خود اپنے خاندان کی بنیاد رکھنے میں ناکام ہوتا ہے۔ اس کا غیر ذمہ دارانہ طرز زندگی مطلق العنانیت کے بہت قریب ہے، جو ایک ایسا طرز حکمرانی ہے، جس میں بادشاہ قانون سے ماورا ہوتا ہے اور جسے اہل ایتھنز نے مسترد کر دیا تھا۔ مردانہ ہیئت حاکم نے ادونس کے جشن کو، اس کے عورتوں کی بے قابو عزاداری سے عبارت ہونے کے سبب، کج ذوقی پر محمول کیا تھا۔ المختصر وہ سیاسی طور پر معذور تھا اور ممکن ہے، اس نے اہل ایتھنز کی تقسیم ذات کے سلسلے میں [معکوس طور پر] مدد کی ہو، ہر اس شے کی تجسیم کے ذریعے جو مدنی زندگی کی ناشائستہ اور مردانہ سماجی اخلاقیات کے منافی ہو! شہری زندگی نے اساطیر کو تبدیل کر دیا۔ دیوتا بعید نظر آنے لگے تھے۔ پرانی رسوم اور کہانیاں مردوں اور عورتوں کو اس الوہی قلمرو میں، جو کبھی اتنی قریب نظر آتی تھی، روشناس کرانے میں تیزی سے ناکام ہوئیں۔ لوگ اس پرانی اساطیری بصیرت کے افسوس سے نکلنے لگے جس نے ان کے آباؤ اجداد کی ذہنی تربیت کی تھی۔ جیسے جیسے شہر زیادہ منظّم ہوئے، پولیس کے ذریعے نظم ونسق زیادہ موثر ہوا اور ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جانے لگا ویسے ویسے دیوتا انسانیت کی ہیئت کذائی کے سلسلے ہی زیادہ بے پروا اور بے تعلق ہوتے گئے۔ اس سے ایک روحانی خلا پیدا ہوا۔ مہذب دنیا کے بعض حصوں میں پرانی روحانیت زوال کا شکار ہوئی مگر اس کی جگہ لینے کیلئے کوئی نئی چیز سامنے نہ آئی۔ نتیجتاً اس ہیجان نے ایک دوسری بڑی کایا کلپ کی راہ ہموار کی۔

☆☆☆

www.MashalBooks.org

محوری عہد

(۸۰۰ تا ۲۰۰ ق م)

آٹھویں صدی قبل مسیح کے آس پاس (عہد عتیق کی روحانیت کے انحطاط سے پیدا ہونے والے) ہیجان نے دنیا کے بہت سے خطوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور دنیا کے چار مختلف خطوں میں پیغمبروں اور حکماء کی ایک متاثر کن جماعت نے کسی نئے حل کی تلاش کا آغاز کر دیا تھا۔ جرمن فلسفی کارل جیسپرس نے اس دور کو ''محوری عہد'' کا نام دیا ہے، کیونکہ یہ انسانیت کی روحانی ترقی میں بنیادی اور محوری (pivotal) ثابت ہوا، اس زمانے میں حاصل کی گئی بصیرتوں نے مردوں اور عورتوں کی ذہنی تربیت کو آج تک جاری رکھا ہوا ہے۔ [٦٧] مذہب کو جیسا ہم سمجھتے ہیں، اس کا آغاز اسی عہد میں ہوا۔ لوگ بے مثال وضاحت، اپنی فطرت، اپنی صورت حال اور اپنی بضاعت سے آگاہ ہوئے۔ نئے مذاہب اور فلسفیانہ نظام نمودار ہوئے۔ چین میں دین کنفیوشس اور تاؤمت، ہندوستان میں بدھ مت اور ہندومت، مشرق وسطیٰ میں توحیدی مذاہب اور یورپ میں یونانی عقلیت پسندی۔ یہ محوری روایات عظیم انسانوں سے وابستہ تھیں۔ مثلاً آٹھویں، ساتویں اور چھٹی صدی کے عظیم عبرانی پیغمبروں سے ہندوستان کے اپنشدوں کے حکماء اور مہاتما بدھ (۵٦۳۔ ۴۸۳ ق م) یا چین کے کنفیوشس (۵۵۱۔۴۷۹ ق م) اور ''داؤدیِ جنگ'' کے مصنف سے یونان کے پانچویں صدی کے المیہ نگار، سقراط (۴٦۹۔۳۹۹ ق م)، افلاطون (۴۲۷۔۳۴۷ ق م) اور ارسطو (۳۸۴۔۳۲۲ ق م)

محوری عہد سے متعلق کافی کچھ ایسا ہے جو پراسرار ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس میں فقط

چینی، ہندوستانی، یونانی اور یہودی ہی کیوں شامل تھے اور میسوپوٹیمیا یا مصر یا اس کے مماثل کوئی چیز نمایاں نہ ہو سکی۔ بلاشبہ یہ درست ہے کہ محوری خطوں میں سیاسی، معاشرتی اور معاشی ہلچل تھی۔ وہاں جنگیں، آبادی کی بے دخلی، قتل و غارت اور شہروں کی تباہی تھی۔ ایک نئی منڈی معیشت بھی ترقی پا رہی تھی، ترقی پادریوں اور بادشاہوں کے ہاتھوں سے نکل کر سوداگروں کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہی تھی اور اس سے اختیار و اقتدار کے درجہ بدرجہ نظام میں خلل پڑ رہا تھا، یہ تمام نئے عقائد دور دراز کے صحراؤں یا کوہستانی خانقاہوں میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ سرمایہ داریت اور پیسے کی ریل پیل کی فضا میں ظاہر ہوئے۔ تاہم اس شورش و ہنگامے سے اس محوری انقلاب کی پوری وضاحت نہیں ہوتی، جس نے بنی نوع انسان کے اس طرز فکر پر انمٹ اثرات مرتب کیے، جس کے ذریعے وہ خود اپنے آپ سے، ایک دوسرے سے اور ارد گرد کی دنیا سے رشتہ قائم کرتے تھے۔

تمام محوری تحریکوں میں لازمی بنیادی اجزا مشترک تھے۔ وہ ان ابتلاؤں سے شدت سے آگاہ تھیں جو انسانی صورت حال کا ناگزیر حصہ محسوس ہوتی تھیں اور ان سب میں اس بات پر اصرار موجود تھا کہ ایک ایسے ارتقاع افروز مذہب کی ضرورت ہے جو خارجی رسومات اور اعمال پر بری طرح منحصر نہ ہو۔ ان میں انفرادی ضمیر اور اخلاق سے متعلق ایک نئی دلچسپی موجود تھی۔ چنانچہ صدیوں سے چلی آ رہی رسوم کو نہایت احتیاط سے ادا کرنا کافی نہیں تھا، عبادت گزاروں کے لئے لازم تھا کہ ساتھی مخلوقات سے احترام سے پیش آئیں۔ تمام حکماء نے اپنے زمانے کے تشدد سے تنفر محسوس کیا اور رحم و عدل کی اخلاقیات کی تبلیغ کی۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کو تعلیم دی کہ وہ صداقت کیلئے خود اپنے اندر جھانکیں اور پادریوں اور دوسرے مذہبی ماہرین کی تعلیمات پر بھروسہ نہ کریں، کسی چیز پر فی الفور اعتماد نہیں کرنا چاہیے، ہر شے پر سوال اٹھانا چاہیے اور جن پرانی اقدار کو اب تک سچ مان لیا گیا ہے، انہیں تنقیدی تجزیے کی زد پر لانا چاہیے۔ جن باتوں کی نئے سرے سے جانچ پرکھ کی ضرورت تھی، ان میں بے شبہ اساطیر شامل تھیں۔

جب محوری تحریکوں نے قدیم اساطیر پر غور و تامل کیا تو ہر ایک نے قدرے مختلف موقف اختیار کیا۔ کچھ تحریکیں، بعض اساطیری رجحانات کی مخالف تھیں، دیگر نے الگ تھلگ رہنے کا رویہ اختیار کیا تاہم تمام تحریکوں نے متعلقہ اساطیر کی زیادہ تر داخلی اور اخلاقی تعبیر کی۔ مدنی زندگی کے

www.MashalBooks.org

آغاز ہی کا مطلب تھا کہ اساطیر کو پہلے کی طرح سچ نہیں مانا جا سکتا، لوگوں نے ان کا تنقیدی جائزہ لینا جاری رکھا، مگر جب ان کا سامنا نفس کے اسرار سے ہوا تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ جبلی طور پر پرانی اساطیر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کہانیوں کی تشکیل نو کی جا سکتی تھی مگر انہیں اب بھی ضروری سمجھا گیا۔ اگر کسی شدت پسند مصلح نے ایک اسطورہ باطل سمجھ کر ترک کر دیا تو یہ بعد ازاں قدرے مختلف بھیس ہی مذہبی نظام میں چپکے سے لوٹ آئی۔ حتیٰ کہ ان ترقی یافتہ مذاہب کے لوگوں نے دریافت کیا کہ اساطیر کے بغیر گزارہ نہیں۔

تاہم اب لوگ تقدیس کا تجربہ اتنی آسانی سے نہیں کر سکتے تھے، جس طرح ان کے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے۔ دیوتا پہلے ہی شہر کے ابتدائی باسیوں میں سے کچھ کے شعور سے مراجعت اختیار کرنے لگے تھے، محوری ممالک کے لوگ اب بھی ماورائیت کے آرزومند تھے، مگر اب الوہیت بعید بلکہ کسی اور دنیا سے متعلق محسوس ہوتی تھی۔ اب ایک خلیج فانی انسانوں کو ان کے دیوتاؤں سے جدا کرتی تھی۔ پہلے کی طرح وہ یکساں فطرت میں شریک نہیں تھے، اب اس امر پر یقین کرنا ممکن نہیں رہا تھا کہ دیوتا اور آدمی یکساں الوہی جوہر سے ماخوذ ہیں۔ ابتدائی عبرانی اساطیر نے دیوتا کا ایک ایسا تصور پیش کیا جس کے مطابق وہ ابراہام [حضرت ابراہیمؑ] کے ساتھ ایک دوست کی طرح کھا پی سکتا اور بات چیت کر سکتا تھا۔ [۶۹] لیکن جب محوری عہد کے پیغمبروں کا سامنا اسی دیوتا سے ہوا تو اس کا تجربہ ایک خوفناک صدمے کی صورت کیا گیا، جو یا تو ان کی زندگیوں کو خطرے میں ڈالتا تھا یا انہیں سراسیمگی اور پامالی کے احساس میں مبتلا کر دیتا تھا۔ [۷۰] حقیقت عظمیٰ تک رسائی اب ناممکن حد تک مشکل لگتی تھی۔ ہندوستان میں بدھ مت کے ماننے والوں نے محسوس کیا کہ وہ نروان کا الوہی اطمینان اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب وہ یوگا کی مشقوں کے ذریعے جو عوام الناس کی پہنچ سے دور تھیں، اپنے معمول کے شعور پر ایک دہشت زدہ کر دینے والا دھاوا بولیں، جب کہ جینیوں نے اس قدر سخت زہد اختیار کیا کہ کچھ لوگ فاقہ زدگی کی وجہ سے موت کے منہ میں چلے گئے۔ چین کے کنفیوسشس کا اعتقاد تھا کہ داؤ [تاؤ] یعنی حقیقت عظمیٰ آدمیوں کی دنیا سے اس درجہ اجنبی ہے کہ اس کے بارے میں کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ [۷۱] اس قطعی مختلف مذہبی تجربے کا مطلب تھا کہ اب اساطیر الوہیت سے متعلق اس آسانی سے اظہار نہیں کر سکتیں جو ہمیں پرانے

نظریہ تجسیمیت [یہ نظریہ کہ خدا انسانی اوصاف رکھتا ہے] میں ملتا ہے۔

اس بحث میں چین کا ذکر زیادہ نہیں ہوا، اس لیے کہ چینیوں نے اپنی اعلیٰ ثقافت میں دیوتاؤں سے متعلق کہانیاں نہیں کہیں۔ چین میں الوہی مجادلے، قریب المرگ دیوتاؤں یا مقدس ازدواج کی حکایات موجود نہیں، وہاں کوئی مقدس ہڑواڑ نہیں، آفرینش عالم سے متعلق کوئی نظریہ نہیں اور انسانی صفات کے حامل کوئی دیوتا نہیں۔ ان کے شہروں کے کوئی سرپرست دیوی دیوتا نہیں تھے اور نہ کوئی مدنی مسلک تھا۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ چینی معاشرے کی کوئی مستحکم اساطیری بنیاد نہیں تھی۔ آباؤاجداد کی پرستش انتہائی ہمیت کی حامل تھی اور اس دنیا کی طرف اشارہ کرتی تھی جسے بنی نوع انسان کی دنیا پر زمانی تقدم حاصل تھا۔ مرحوم اقربا کے لئے رسومات نے چینیوں کو ایک مثالی سماجی نظام کا نمونہ فراہم کیا۔ جسے ایک خاندان سمجھا گیا اور جو آداب مجلس کا پابند تھا۔ دریاؤں، ستاروں، ہواؤں اور فصلوں سب میں ارواح حلول کیے ہوئے تھیں جو آسمانی دیوتا ذی (جسے بعد میں تیان یعنی آسمان کہا گیا) کی فرمانبرداری کرتے ہوئے مل جل کر ہم آہنگی کی فضا میں رہتی تھیں۔ دیگر آسمانی دیوتاؤں کے برعکس چینی خدائے اعظم غائب نہیں ہوا۔ وہ سانگ حکمرانوں (۷۶۶ــ۱۱۲۶ ق م) کے وقت مزید نمایاں ہوا۔ بادشاہ کا جواز اس امر سے اخذ کیا جاتا تھا کہ فقط اسے ہی دی تیان تک رسائی حاصل ہے اور قدیم زمانے سے چلے آ رہے فلسفے کے اصولوں کے مطابق بادشاہ خدا کا زمینی ہم منصب ہے۔ یہ ایک ایسی اسطورہ ہے جو ۱۹۱۱ء کے انقلاب تک چینی ثقافت میں باقی رہی۔ زمینی حکومت، آسمان کے بندوبست کے حمائل تھی، وزراء بادشاہ کی اسی طرح مدد کرتے تھے، جس طرح کائنات کے انتظام میں تیان کی معاونت عناصر کے دیوتا کرتے تھے۔

چینی لوگ محوری ثقافتی رویوں کی ذہنی جستجو میں دیگر ثقافتوں کے مقابلے میں پہلے سے مصروف محسوس ہوتے تھے۔ ۱۱۲۶ ق م میں، دریائے وائی (Wei) کی وادی، موجودہ شینسائی صوبے کے ایک شخص نے شانگ ریاست کا تختہ الٹ دیا اور زہو (Zhou) سلطنت قائم کر دی۔ زہو خاندان نے دعویٰ کیا کہ آخری شانگ بادشاہ بدعنوان ہو گیا تھا اور یہ کہ تیان نے لوگوں کے آرام کا احساس کرتے ہوئے زہو خاندان کو حق حکمرانی تفویض کر دیا۔ اسی اسطورہ نے تیان کو اخلاقی کردار عنایت کر دیا۔ زہو خاندان نے آسمان کے نظم و نسق کا جشن ان مفصل رسمی تقریبات

www.MashalBooks.org

کے ذریعے منایا جو حد درجہ خوبصورت موسیقی کی حامل تھیں۔ اس اجتماعی عبادت کا تجربہ سماجی ہم آہنگی کے ظہور کے طور پر کیا گیا جو بجائے خود الوہی تھی۔ زندہ یا مرحوم تمام شرکاء کو ان تقریبات کی اتباع کرنی ہوتی تھی۔ تمام ہستیوں، ارواح، آباؤ اجداد، انسان، کا اپنا اپنا خصوصی مقام تھا، ہر ایک کو اپنی پسند، ناپسند اور شخصی میلانات کو رسوم کے تابع کرنا پڑتا تھا، اس سے کائنات کا مثالی نظام، مردوں اور عورتوں کی ناقص دنیا کی ایک حقیقت بن جاتا تھا۔ رسومات اہم تھیں، نہ کہ انہیں ادا کرنے والے، افراد مقدس دنیا کی گرفت میں اور اس میں ڈوبا ہوا محسوس کرتے تھے جو کائنات اور خود ان کی مدنیت کی بنیاد تھی۔ تاہم کنفیوسشس کے عہد تک زہو سلطنت زوال کا شکار ہو چکی تھی اور پرانا نظام برباد ہو گیا تھا۔ کنفیوسشس نے اس طوائف الملوکی کا سبب، رسومات اور طے شدہ طرز عمل (لی) سے لاپروائی قرار دیا، جس نے لوگوں کو تعلیم دی تھی کہ انہیں ایک دوسرے سے کس قسم کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اب آداب و قواعد کو ایک طرف ڈال دیا گیا تھا اور لوگوں نے اپنے خود غرضانہ مفادات کی پیروی شروع کر دی تھی۔ کچھ پرانی اساطیر میں نشان دہی کر دی گئی تھی کہ تخلیقیت کی بنیاد ایثار ذات پر ہے، تاہم محوری عہد کے حکماء نے اس بصیرت کے اخلاقی نتائج کو مزید واضح کیا۔ ہر وہ شخص جو اپنی انسانیت کی تکمیل چاہتا تھا، اسے اپنی روزمرہ زندگی ایثار خود پر عمل کرنا لازم تھا۔[۷۲] کنفیوسشس نے قدیم چینی ثقافتی مزاج کو ہمدردی کی محوری قدر سے آمیز کر دیا۔ انہوں نے رین یعنی ''محاسن انسانی'' کے آدرش کو فروغ دیا جو لوگوں سے تقاضا کرتا تھا کہ ''دوسروں سے محبت کرو''۔[۷۳] وہ اس سنہری اصول کو لاگو کرنے والے پہلے شخص تھے: ''جو کچھ اپنے لیے روا نہیں سمجھا، اسے دوسروں کیلئے بھی روا نہ سمجھو''۔[۷۴] محوری روح عصر خود بینی اور تجزیہ ذات کا مطالبہ کرتی تھی، یعنی ذات کے گہرے منطقوں کے تفصیلی تجزیے پر زور دیتی تھی۔ آپ دوسروں سے اس وقت تک صحیح برتاؤ نہیں کر سکتے، جب تک آپ پہلے اپنی ضرورتوں، محرکات اور میلانات کا تجزیہ نہ کر چکے ہوں، دوسروں کی مناسب تعظیم کیلئے شو (''اپنے آپ کے مشابہ بنانا'') کا عمل درکار رہے۔[۷۵]

تاہم کنفیوسشس نے یہ جان لیا کہ یہ سب محض ارادے یا عقلی غور و فکر سے ممکن نہیں۔ خود غرضی سے مطلق طور پر ماورا ہونے کی منزل کو رسوم اور موسیقی کی کیمیاء کے ذریعے سر کیا جا سکتا ہے، جو تمام عظیم آرٹ کی طرح بنی نوع انسان کی اس سطح پر قلب ماہیت کرتے ہیں جو فکر کے مقابلے میں گہری ہے۔[۷۶] تاہم محض رسومات میں بس شریک ہو لینا کافی نہیں تھا، ان کے پیچھے موجود روح کو سمجھنا لازم تھا جو ''اطاعت گزاری'' (رنگ) کا رویہ جاگزیں کرتی تھی تاکہ تکبر، کینے اور حسد پر غالب ہوا جا سکے۔[۷۷] جب پجاری، رسوم میں شریک دوسرے لوگوں کے آگے جھکتے تھے، کسی رسم کے مطالبات کے آگے تسلیم بجا لاتے تھے اور ضرورت پڑنے پر دوسروں کو پہل کرنے کی اجازت دیتے تھے، یہ سب ارفع موسیقی کی سنگت میں ہوتا، تو وہ یہ بات سیکھتے تھے کہ روزمرہ معاملات اور رشتوں میں اپنے ساتھیوں سے کس طور پیش آنا ہے۔ کنفیوسشس نے (اس سب کے لئے) ماضی کے مثالی تمدنوں کی طرف دیکھا۔ چینیوں کے پاس دیوتاؤں کی کتھائیں نہیں تھیں، مگر وہ ثقافتی سورماؤں (کلچر ہیرو) کی تعظیم کرتے تھے جو اصل میں اساطیری شخصیات تھیں، پر انہیں تاریخی خیال کیا گیا تھا۔ انتہائی قدیم زمانے کے پانچ برگزیدہ بادشاہوں میں سے دو، کنفیوسشس کے خصوصی ہیرو تھے، پہلا یاؤ (Yao) تھا، جس نے نہ صرف چینیوں کو رسم اور موسیقی کے صحیح استعمال کی تعلیم دی تھی، بلکہ ''رنگ'' کی صفت کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ چونکہ اس نے اپنے بیٹوں میں سے کسی کو حکمران کے قابل نہیں سمجھا تھا، اس لئے پاکباز کسان شون (Shun) کو اپنا جاں نشین منتخب کر لیا تھا۔ شون نے بھی غیر معمولی بے غرضی کا مظاہرہ کیا، جب اس نے اپنے باپ اور بھائیوں سے محبت کا سلوک جاری رکھا اور ان سے عزت و احترام سے پیش آتا رہا، حالانکہ انہوں نے اسے مارنے کی کوشش کی تھی۔

تاہم کنفیوسشس کے لئے رسوم، اگر انہیں ٹھیک طرح سمجھ لیا گیا ہو، ان اساطیری کتھاؤں کے مقابلے میں زیادہ اہم تھیں۔ ویدوں کے عہد کے ہندوستان میں اس سے ملتی جلتی باتیں ہو رہی تھیں، جہاں قربانی کی رسوم نے ان دیوتاؤں کو گہنا دیا تھا، جنہیں قربانی پیش کی جاتی تھی۔ دیوتا بتدریج مذہبی شعور سے پسپائی اختیار کر رہے تھے اور آٹھویں صدی قبل مسیح کے مذہبی رسوم کے مصلحین نے ایک نئی طرز کی پرستش وضع کی جس میں تنہا فرد کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ آدمی مدد کے لئے دیوتاؤں پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے، انہیں رسومات کے میدان میں خود اپنے لئے ایک منظّم دنیا خلق کرنا پڑی۔ ان رسومات سے تحریک پانے والی طاقت، جسے برہمن کہا

www.MashalBooks.org

گیا، کا تجربہ اس قدر غلبہ آفریں تھا کہ اسے ہی مطلق حقیقت سمجھا گیا جو دیوتاؤں سے ماورا تھی اور دنیا کو وجود پذیر کرتی تھی۔ آج بھی مذہبی تہوار ایک ایسا وجود پیدا کر سکتا ہے، جسے ہندوستانی 'انیہ مانس' کہتے ہیں، یعنی 'ذہن دیگر' جو تمام دینوی شعور سے قطعی مختلف ہے۔ ہندوستانیوں اور چینیوں کا اجتماعی پرستش پر اصرار، ہمیں ایک بار پھر یاد دلاتا ہے کہ اسطورہ کو اس کے سیاق وسباق سے الگ کر کے، جداگانہ طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ اسطورہ اور پرستش کا خاص طریقہ یکساں مرتبے کے حصہ دار ہیں، دونوں تقدیس کے احساس کی ترسیل میں مدد کرتے ہیں اور عام طور پر اکٹھے کرتے ہیں، تاہم بعض اوقات رسم کو اولیت حاصل ہو جاتی ہے۔

بایں ہمہ محوری عہد کے حکماء نے ایک تیسرے جز پر زور دیا۔ اسطورہ کے اصلی معنی کو سمجھنے کیلئے آپ کو نہ صرف رسوم ادا کرنی چاہئیں جو اسطورہ کو جذباتی گونج عطا کرتی ہیں، بلکہ آپ کے لئے صحیح اخلاقی طریقے سے پیش آنا بھی لازم ہے۔ جب تک آپ کی روزمرہ زندگی کی ترکیب میں وہ سب شامل نہیں ہوتا جسے کنفیوشس رین، رنگ اور شو کہتے ہیں، یاؤیاشون کی طرح کی اسطورہ تجریدی اور دھندلی رہے گی۔ ویدی ہندوستان میں رسومی اعمال کو کرم (کام) کہا گیا۔ تاہم بدھ کو قربانی کی رسم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے کرم کی نئی تعریف کرتے ہوئے انہیں ایسے ارادے کہا جو ہماری روزمرہ اعمال کا محرک ہوتے ہیں۔ [۷۸] ہماری غرض وغایت، داخلی کرم ہیں، یعنی ایسے ذہنی اعمال جو رسم کی ادائیگی سے کہیں زیادہ اہم ہیں اور خارجی اعمال ہی کی طرح اہم ہیں۔ یہ ایک انقلاب تھا جو محوری عہد سے مخصوص تھا، اس نے اخلاقیات اور اساطیر کے فہم کو گہرا اور داخلیت آشنا کیا۔ اسطورہ ہمیشہ عمل کا تقاضا کرتی تھی۔ محوری عہد کے حکماء نے واضح کیا کہ اسطورہ کی مکمل معنویت اس وقت تک منکشف نہیں ہو سکتی، جب تک یہ روزمرہ زندگی میں عملی ہمدردی اور انصاف پر عمل کرنے کی طرف راہنمائی نہیں کرتی۔

داؤدِی جنگ کے تیسری صدی قبل مسیح کے مصنف جن کا روایتی نام لاؤزی ہے، وہ بھی روایتی رسوم کے بارے میں منفی نقطہ نظر رکھتے تھے۔ لی کی بجائے وہ ارتکاز کی ان مشقوں پر بھروسہ کرتے تھے جو یوگا کی ہندوستانی مشق سے ملتی جلتی تھیں۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ تہذیب ایک خطا تھی جس نے انسانوں کو ان کے سچے راستے (داؤ) سے بھٹکایا۔ لاؤزی نے زرعی سادگی

کے سنہری زمانے کو مڑ کر دیکھا جب لوگ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں رہتے تھے جہاں نہ ٹیکنالوجی تھی، نہ آرٹ یا کلچر تھے اور نہ جنگ تھی۔ [۷۹] چینیوں کا اعتقاد تھا کہ اس سنہری زمانے کا خاتمہ ثقافتی سورمے شین نونگ (Shen Nong) کی موت کے ساتھ ہوا، جس نے اپنی جان دے کر بنی نوع انسان کو زراعت کی سائنس سکھائی۔ شین نونگ نے ذاتی طور پر تمام پودوں کا ذائقہ چکھا، یہ جاننے کیلئے کہ کون سے خوردنی ہیں اور ایک مرتبہ وہ ایک دن میں ستر بار زہرخورانی کا شکار ہوا۔ تیسری صدی قبل مسیح تک، جب زیادہ طاقتور سلطنتیں، ایک کے بعد ایک تباہ کن جنگ میں چھوٹی ریاستوں اور گروہوں کو ہڑپ کرتی جا رہی تھیں، شین نونگ کی اسطورہ تبدیل ہو چکی تھی۔ اب اسے مثالی حکمران قرار دے دیا گیا۔ کہا گیا کہ اس نے مرکز گریز سلطنت پر راج کیا، اپنے عوام کے شانہ بشانہ اپنے کھیتوں میں ہل چلائے اور بغیر وزراء، قوانین اور سزاؤں کے حکمرانی کی۔ آدرش پسند راہبوں نے عوامی زندگی سے علیحدگی اختیار کر لی تا کہ شین نونگ کے آدرش کو دوبارہ تخلیق کر سکیں، نیز داؤدِی جنگ'' جو ایک چھوٹی ریاست کے حاکم کو مخاطب کرتی ہے، اسی طرح کی نصیحت کرتی ہے۔ پیچھے ہٹنا، جھک جانا اور کچھ نہ کرنا بہتر ہے، یہاں تک کہ بڑی طاقتیں خود اپنی توسیع پسندی سے خود کو ہلکان نہ کر لیں۔

تاہم محوری عہد کے تمام اساتذہ کی مانند لاؤزی کا سروکار محض بقاء کے عملی طریقے نہیں تھے، بلکہ اس کا مقصود مادی انتشار کے درمیان غیر معمولی امن کے سرچشمے کی تلاش تھا۔ وہ حقیقت مطلقہ داؤ کی آرزو کرتے ہیں جو دیوتاؤں سے ماورا ہے اور وجود کلی کی امٹ بنیاد ہے۔ پر ہر اس شے سے ماورا ہے، جس کا ہم تصور کر سکتے ہیں، تاہم اگر ہم خودغرضانہ خواہش اور لالچ کے بغیر ایک باطنی خالی پن کی پرداخت کر سکیں اور رحم وہمدردی کے ساتھ جئیں تو ہم داؤ سے ہم آہنگ ہوں گے اور اس طرح ہماری قلب ماہیت ہو جائے گی۔ جب ہم تہذیب کے ہدف اساس مزاج کو ترک کر دیں گے تو ہم اس طریقے سے ہم آہنگ ہو جائیں گے جس کے مطابق چیزوں کو ہونا چاہیے۔ [۸۰] تاہم جیسا کہ لاؤزی مثال شہری ریاست کو واضح کرتے ہوئے شین نون کے اساطیری سنہری زمانے کی طرف رجوع کرتے ہیں، اسی طرح وہ روایتی اساطیر (جو مقبول عام ثقافت میں رائج ہو سکتی ہیں) کی طرف بھی پلٹتے ہیں تا کہ داؤ کو اکسایا جا سکے۔ داؤ سرچشمہ حیات ہے، جد کامل

www.MashalBooks.org

ہے اور مادر بھی ہے۔قبل تاریخ کے بنی نوع انسان نے مادرِ عظمیٰ کو تندخو اور متشدد دیکھا تھا مگر نئی محوری روح عصر میں لاؤزی نے اسے دردمندی کی صفات کی حامل قرار دیا۔ وہ بے غرضی سے وابستہ ہے جسے حقیقی تخلیقیت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔[۸۱] قبل تاریخ کے مرد اور عورتیں کبھی کبھی زیر زمین غاروں میں روپوش ہو کر کوکھ میں واپسی کی تمثیل پیش کیا کرتے تھے۔ لاؤزی حکیم دانا یعنی ایک کامل انسان کو یہ واپسی، آفاق کے طریقے سے ہم آہنگ ہونے کی صورت میں ممکن بناتے ہوئے تصور کرتے ہیں۔

لاؤزی اور بدھ دونوں اس امر پر راضی تھے کہ پرانی اساطیر کو نئے خیالات کی تفہیم میں لوگوں کی مدد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مہاتما بدھ نے اس اعتقاد کے ذریعے کہ جانوروں کی قربانی نہ صرف بے فائدہ ہے بلکہ سفاکانہ بھی ہے، ویدی رسوم پرستی پر حملہ کیا، تاہم روایتی اساطیر کے وہ روادار تھے۔ انہیں اب دیوتاؤں کے بارے میں یقین نہیں رہا تھا کہ وہ حسب دل خواہ موثر ہیں۔ تاہم وہ انہیں خاموشی سے کنارے لگانے کے قائل تھے اور ان کے خلاف وہ کوئی نظریاتی جارحیت شروع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ مہاتما بدھ نے دیوتاؤں کو ایک نئی علامتی معنویت بھی دی۔ ان کی اپنی زندگی سے متعلق بعض کہانیوں میں برہما (خالق کائنات) اور مر (موت کا خدا) جیسے دیوتا ان کی اپنی داخلی حالتوں کی عکاسی کرتے محسوس ہوتے ہیں یا متصادم ذہنی قوتوں کی تجسیم محسوس ہوتے ہیں۔[۸۲]

دوسری طرف اسرائیل کے پیغمبر یہ لچکدار رویہ اختیار نہیں کر سکتے تھے، وہ ان پرانی اساطیر کے خلاف سختی سے نبرد آزما ہونے پر خود کو مجبور پاتے تھے جنہیں محوری اصلاح سے غیر ہم آہنگ پاتے تھے۔ صدیوں تک اسرائیلیوں نے مشرق قریب مین اشیرہ، لعل اور اشتر کے ساتھ ساتھ اپنے دیوتا یہوہ کی پرستش کرتے ہوئے اساطیری اور رسوماتی زندگی بسر کی تھی۔ لیکن اب کے یہوہ اتنا بعید محسوس ہوتا تھا، ہوسیا، جرمیاہ اور ایزیکیل جیسے پیغمبر پرانی تجسیمی اساطیر پر اساسی نوعیت کی نظر ثانی کرنے لگے تھے، چونکہ پرانی کہانیاں اب خالی خولی نظر آتی تھیں، اس لئے انہیں باطل قرار دے دیا گیا۔ ان کا خدا یہوہ، جس کی اعلیٰ وارفع ماورائیت نے ان کہانیوں کی فرسودگی کو ظاہر کیا، صرف وہی خدا تھا، انہوں نے پرانے مذہب کے خلاف مظاہرہ شروع کیا۔ خود یہوہ کو الوہی کونسل

کی قیادت کیلئے جنگی اقدام کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے، جو اس امر کی نشاندہی بھی کرتا ہے کہ اس کے ساتھی دیوتا، انصاف اور ترحُّم کی محوری اقدار سے صرف نظر کر رہے ہیں، اس لیے وہ فانی انسانوں کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے۔[۸۳] جوشوا، ڈیوڈ اور ہوسیاہ بادشاہ کو مقامی مادہ پرستانہ فرقوں کو تشدد سے خاتمہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔[۸۴] اور لعل اور مردوک کے مجسموں کا مضحکہ اڑایا گیا ہے، جیسے وہ آدمیوں کے بنائے ہوئے ہوں، مکمل طور پر سونے اور چاندی پر مشتمل ہوں اور انہیں کسی دست کار نے دو گھنٹوں میں جوڑ جاڑ لیا ہو۔[۸۵]

بلاشبہ یہ مشرقِ وسطیٰ کے ''مادہ پرستانہ مذہب'' (Paganism) کا تخفیفی تصور تھا۔ تاہم مذہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب ایک مرتبہ کوئی اسطورہ لوگوں کو ماورائیت سے آگاہ کرنا بند کر دیتی ہے تو وہ مکروہ بن جاتی ہے۔ وحدانیت یعنی صرف ایک خدا پر ایمان، ابتداء میں ایک جدوجہد تھی۔ بہت سے اسرائیلی اب بھی پرانی اساطیر کا لبھاؤ محسوس کرتے تھے اور انہیں اس کشش سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ انہیں اپنے ہمسایوں کی اساطیری دنیا سے دردناک انداز میں علیحدہ کیا جا رہا ہے اور وہ اجنبی بنتے جا رہے ہیں۔ ہم جرمیاہ کی مصیبت میں اس تشنج کو محسوس کرتے ہیں، جنہوں نے اپنے دیوتا کا تجربہ ایک ایسی تکلیف میں کیا جس نے ان کے ہر ایک عضو کو توڑ مروڑ کے رکھ دیا۔ ایزی کیل کی انوکھی سرگزشت میں بھی یہ سب نظر آتا ہے، جن کی زندگی بنیادی نوعیت کے عدم تسلسل کی مثال بن گئی تھی۔ ایزی کیل کو خدا فضلہ کھانے کی ہدایت کرتا ہے، اپنی مرحومہ بیوی کے سوگ سے منع کر دیا جاتا ہے، ان پر خوف اور بے قابو لرزہ غالب آ جاتا ہے۔ محوری پیغمبروں نے محسوس کیا کہ ایک نامعلوم دنیا میں وہ اپنے لوگوں سے بات چیت کر رہے ہیں، جہاں کسی شے کو یوں ہی تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور معمول کے ردِ اعمال سے انہیں محروم کر دیا گیا ہے۔

تاہم انجام کار اس افتاد نے تسکی بخش اعتماد کی راہ ہموار کی اور وہ مذہب جسے ہم آج یہودیت کہتے ہیں، وجود میں آیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ خود اعتمادی ایک عظیم تباہی کے بعد آئی۔ ۵۸۶ میں بابل کے بادشاہ نبوشدریزر (Nebuchadrezzar) نے یروشلم کا شہر فتح کیا اور یہوہ کا مندر تباہ کر دیا۔ بہت سے اسرائیلیوں کو بابل کی طرف دیس نکالا دے دیا گیا، جہاں جلاوطن اسرائیلیوں کا سامنا بلند قامت

www.MashalBooks.org

ستونوں والے معبدوں، شہر کی اجتماعی عبادت سے بھرپور زندگی اور ایسا گیلا کے بھاری بھرکم مندر سے ہوا۔ تاہم یہی وہ جگہ تھی جہاں ''مادہ پرستانہ مذہب'' نے اپنی کشش کھو دی۔ ہم کتاب پیدائش کے پہلے باب میں ایک نیا طرز فکر و احساس دیکھتے ہیں، جسے غالباً نام نہاد ''پیشوائیت کے مکتب'' کے ایک رکن نے لکھا، جسے پرانی جنگجویانہ کونیات کے خلاف، ضبط پسند پر اعتماد مناظرے کے طور پر پڑھا جا سکتا ہے۔ پر اعتماد، پرسکون، منظّم نثر میں لکھی آفرینش عالم سے متعلق یہ نئی اسطورہ بابل کی کونیات پر شک کی نظر ڈالتی ہے۔ مردوک کے برعکس اسرائیل کے دیوتا کو نئی دنیا کی تخلیق کے لئے خطرناک جنگیں نہیں لڑنا پڑتیں۔ وہ تمام اشیاء کو بغیر کسی کوشش کے، محض حکم سے وجود میں لاتا ہے۔ سورج، چاند، ستارے، آسمان اور زمین خود اپنے آپ میں دیوتا یہوہ کے مخالف نہیں ہیں۔ وہ اس کے مطیع ہیں اور انہیں خالص عملی مقصد کے تحت پیدا کیا گی ہے۔ سمندر عفریت قیامت نہیں ہے، بلکہ خدا کی مخلوق ہے اور اس کا حکم بجا لائی ہے۔ یہوہ کا تخلیقی عمل، مردوک کے تخلیقی عمل سے اس قدر افضل ہے کہ اس کی کبھی تکرار یا تجدید نہیں ہوتی۔ جہاں بابلی دیوتا، انتشار کی قوتوں کے خلاف ایک لگاتار جنگ میں مصروف ہوتے تھے اور انہیں اپنی توانائی کی بحالی کیلئے سال نو کے جشن کی رسومات کی ضرورت رہتی تھی، وہاں یہوہ اپنے کام کی تکمیل کے بعد ساتویں دن آرام کر سکتا ہے۔

تاہم اسرائیلی، مشرق وسطیٰ کی پرانی اساطیر کو بوقت ضرورت بخوشی استعمال کرتے تھے۔ کتاب خروج میں، ریڈس کے سمندر کو عبور کرنے کا واقعہ بالکل ایک اسطورہ کی طرح بیان کیا گیا ہے۔ [۸۶] پانی میں غرقابی کو روایتی طور پر تبدیلی حالت کی ایک رسم کے طور پر لیا گیا، دیگر دیوتاؤں نے جب دنیا کو تخلیق کیا تو سمندر کو پھاڑ کر آدھا کر دیا۔ اگرچہ خروج کی اسطورہ میں جو چیز وجود میں آئی ہے، وہ کائنات نہیں بلکہ لوگ ہیں، جس پیغمبر کو ہم عیساہ ثانی کے نام سے جانتے ہیں۔ جو چھٹی صدی کے وسط میں بابل میں فعال تھے، انہوں نے واضح غیر مبہم وحدانیت کی تشکیل کی۔ اس میں کوئی کرختگی نہیں، انہیں کوئی شک نہیں کہ یہوہ ہی صرف خدا ہے اور دیگر دیوتاؤں کی باہمی عملی مخالفت باقی نہیں رہی۔ تاہم وہ تخلیق کی قدیم اساطیر کی یاد تازہ کرتے ہیں جن میں یہوہ کو مشرق وسطیٰ کے کسی بھی دوسرے دیوتا کی مانند تخلیق دنیا کے سلسلے میں سمندری عفریتوں سے نبرد آزما دکھایا گیا ہے۔ یہوہ کا خروج کے وقت ریڈس کے سمندر کو پھاڑنا، قدیم اساسی سمندر پر مشرق

وسطیٰ کے دیوتاؤں کی فتح کے مساوی سمجھا گیا۔ اسرائیلی اب اپنے زمانے میں الوہی قوت کے اسی طرح کے مظاہرے کی توقع کر سکتے تھے، کیوں کہ خدا ان کی جلاوطنی کو کالعدم کرنے والا اور انہیں واپس گھر لانے والا تھا۔ ''گل گامش کا رزمیہ'' کے بابلی مصنف نے قدیم تاریخ اور اساطیر کو یکجا کیا تھا مگر عیساہ ثانی اس سے آگے بڑھتے ہیں۔ وہ اپنے خدا کے اساسی اعمال کو موجودہ واقعات سے جوڑتے ہیں۔ [۸۷]

یونان میں لوگوس (تعقل) نے محوری عہد کو تقویت دی، جو اسطورہ سے ذہن کی ایک مختلف سطح پر کارفرما تھا، جہاں اسطورہ کو اپنے بامعنی ہونے کے لئے یا تو جذباتی شرکت درکار ہے یا ایک قسم کی رسوماتی نقل، وہاں لوگوس محتاط تفتیش کے ذریعے سچائی ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایک ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے جو تنقیدی ذہانت کے لئے کشش رکھتا ہو۔ آئیونیا کی یونانی نو آبادیوں میں، جواب ترکی ہے، اولین طبیعیات دانوں نے پرانی کونیاتی اساطیر کی عقلی بنیادیں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ سائنسی سرگرمی ابھی تک پرانے اساطیری اور آرکی ٹائپل نظام میں ملفوف تھی۔ ایک طرح سے یہ ''انیوما ایلش'' (Enuma Elish) کی یاد دلاتی تھی، یعنی انہوں نے دنیا کو قدیم اساسی مادے سے نمودار ہوتے دیکھا، کسی الوہی تحریک کے تحت نہیں، بلکہ کائنات کے باقاعدہ قوانین کے مطابق، انا کسی مندر ۶۱۱۰-۵۴۷ ق م) کے مطابق بنیادی آرکی (اصول) ہمارے انسانی تجربے میں آنے والی کسی شے کے بالکل برعکس تھا۔ اس نے اسے ''لامتناہی'' کہا، ہماری دنیا کے جانے پہچانے عناصر اس میں سے ایک ایسے عمل کے ذریعے ظاہر ہوئے جس پر حرارت اور ٹھنڈک باری باری غالب ہو رہی تھیں، انا کسی منیس (م ۵۰۰ ق م) کو یقین تھا کہ آرکی لامتناہی ہوا ہے، جب کہ ہیراکلی توس (تخمیناً ۵۰۰ ق م میں زندہ تھا) کے نزدیک یہ آگ تھی۔ یہ ابتدائی قیاسات اتنے ہی افسانوی تھے، جتنی پرانی اساطیر کیوں کہ ان کی تصدیق کا کوئی طریقہ موجود نہیں تھا۔ شاعر زینوفیش (تخمیناً ۵۴۰-۵۰۰ ق م میں حیات تھا) نے اس بات کا ادراک کیا اور انسانی فکر کی بضاعت پر غور کیا۔ اس نے ایک عقلی دینیات لکھنے کی سعی کی، جس میں دیوتاؤں سے متعلق تجسیمی اساطیر کو مسترد کیا گیا ایک ایسی الوہی ہستی کو پیش کیا گیا جو ''فوسیکوئی'' (Phusikoi) کی سائنس سے مطابقت رکھتی تھی، یعنی ایک تجریدی، غیر شخصی قوت تھی، اخلاقی لیکن بے حرکت علم

www.MashalBooks.org

کلی اور طاقت کلی کی حامل تھی۔

آئیونیا کی طبیعیات، یونان میں محوری روح عصر کا اولین اظہار تھا۔ اس میں چند لوگوں ہی کو دلچسپی تھی۔ چوتھی صدی میں فلسفے کے لئے جوش کے جڑ پکڑنے سے پہلے، ایتھنز رسوم کی ایک نئی قسم یعنی المیے کی نقل کو رواج دے چکے تھے، جس میں پرانی اساطیر کو مذہبی جشن کے تناظر میں متانت کے ساتھ سٹیج پر مکرر ادا کیا جاتا تھا، تاہم اس کے ساتھ ساتھ انہیں گہرے تجزیے کا موضوع بھی بنایا جاتا تھا۔ اسیکائلس (۵۲۵۔۴۵۶ ق م)، سوفوکلیس ۴۹۶۰ ۔ ۴۰۵ ق م) اور یوری پیڈیس (۴۸۰۔۴۰۶ ق م) سب نے دیوتاؤں کو ان ناظرین کے سامنے کٹہرے میں لا کھڑا کیا جو سماعت کرنے والی عدالت، کی مانند تھے۔ اسطورہ خود اپنے آپ پر سوال نہیں اٹھاتی، یہ ایک حد تک خود شناسی کا تقاضا کرتی ہے۔ تاہم المیے نے روایتی اساطیر اور خود کے درمیان کچھ فاصلہ قائم کیا اور انتہائی بنیادی یونانی اقدار میں سے بعض پر شبہات کا اظہار کیا۔ کیا دیوتا واقعی بے عیب اور انصاف پسند تھے؟ ہیرو پرستی، یونانیت یا جمہوریت کی قدر و قیمت کیا ہے؟ المیہ اس عہد میں سامنے آیا جب پرانی اساطیر کا شہری ریاستوں کی نئی سیاسی حقیقتوں سے رابطہ دم توڑنے لگا تھا۔ ایڈی پس جیسا ہیرو ابھی تک روایتی اساطیری آدرشوں کا گرویدہ ہے، مگر وہ اس کے مخمصے کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں کرتے۔ جہاں ہیرو اپنے راستے کی مشکلات سے نبرد آزما ہوتا ہوا فتح تک یا کم از کم عزم و حوصلے کی کسی سطح پر پہنچتا ہے، وہاں المیہ ہیرو کی مشکلات کے حل کے کوئی طریقے موجود نہیں۔ درد اور خلفشار میں گرفتار ہیرو کو شعوری انتخاب کرنا اور ان کے نتائج کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

تاہم اپنی تمام تر روایت شکنی کے باوجود، المیہ روایتی رسوماتی ہیئیت کا علم بردار تھا۔ کسی بھی مذہبی رسم کی مانند پر انفرادی دکھ میں سماجی شرکت کے عمل کی نمائندگی کرتا تھا مگر یہ پہلی مرتبہ تھا کہ شہری مذہبی زندگی میں داخل زندگی کو شامل کیا گیا۔ یونانی ڈرامے، کایا کلپ کے دیوتا دایوتائیوس کے جشن کے دوران میں پیش کیے جاتے تھے اور غالباً انہوں نے ایتھنز کے نوجوانوں کی ابتدائی تربیت اور مکمل شہریت کے حصول میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ابتدائی تربیت کی کسی بھی مشق کی طرح، المیہ اپنے ناظرین کو نا قابل گفتار، کا سامنا کرنے اور شدت کا تجربہ کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ یہ قربانی کی آئیڈیالوجی کے قریب ہے، کیونکہ تزکیہ نفس (کتھارسس) کرتا ہے، جو دل اور دماغ پر رحم اور دہشت کے جذبات

کے شدید غلبے سے حاصل ہونے والی داخلی تطہیر ہے۔ لیکن قربانی کی اس نئی صورت میں محوری درد مندی سرائیت کیے ہوئے تھی، کیونکہ ناظرین ایک دوسرے شخص کی تکلیف کو اس طور محسوس کرنا سیکھتے تھے، جیسے یہ خود ان کی اپنی ہو، یوں اپنی ہم دردی اور انسانیت کا دائرہ وسیع کرتے تھے۔

افلاطون کو المیہ ناپسند تھا، کیونکہ یہ جذبات سے لبریز تھا، اسے یقین تھا کہ یہ روح کے غیر عقلی حصے کی پرورش کرتا ہے، جب کہ اس کا اعتقاد تھا کہ انسان ''لوگوس'' کے ذریعے ہی اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لا سکتے ہیں۔[۸۸] اس نے اساطیر کا موازنہ بوڑھی بیویوں کی کہانیوں سے کیا۔ صرف منطقی، استدلالی کلامیے ہی حقیقی فہم پیدا کرتے ہیں۔[۸۹] افلاطون کے ابدی اعیان کے نظریے کو، الوہی آرکی ٹائپ کی اس قدیمی اسطورہ کے فلسفیانہ متن کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، دنیوی چیزیں جس کا محض سایہ ہیں، مگر افلاطون کے نزدیک، محبت، حسن، انصاف اور خیر کے اعیان کا کشف یا تفہیم اسطورہ یا رسوم کی بصیرتوں سے نہیں، بلکہ صرف ذہن کی استدلالی قوتوں سے ممکن ہے۔ ارسطو، افلاطون سے متفق تھا۔ اسے پرانی اساطیر نا قابل فہم لگیں:
''کیونکہ وہ اولین اصولوں کو دیوتا بناتی ہیں یا دیوتاؤں سے اخذ کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ جس نے پھولوں کا رس (نقطار) یا سوم رس نہیں چکھا، وہ فانی ہے...... مگر جہاں تک ان اسباب کے عملی اطلاق کا تعلق ہے، ان کے دعوے ہمارے فہم سے بالاتر ہیں۔'' ارسطو دیومالا کا مطالعہ ایک فلسفیانہ متن کے طور پر کر رہا تھا۔ سائنسی تناظر میں یہ اساطیر بے معنی اور بکواس ہیں اور سچائی کے سنجیدہ متلاشی کو ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے عملی ثبوتوں کے ذریعے استدلال کرتے ہیں۔[۹۰] ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فلسفے کے مطالعے نے مائی تھوس (دیومالائی) اور لوگوس (تعقل) کے درمیان رخنہ ڈال دیا تھا، جو اب تک ایک دوسرے کا تکملہ تھے۔

تاہم کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اسطورہ کے سلسلے میں تمام تر عدم برداشت کے باوجود افلاطون نے اسے ان خیالات کی تحقیق کے سلسلے میں اہم کردار تفویض کیا جو فلسفیانہ زبان کے دائرے سے باہر پڑتے تھے۔ ہم لوگوس کے معنی میں خیر پر بات نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ ہستی نہیں، بلکہ ''ہستی'' اور ''علم'' دونوں کا سرچشمہ ہے۔ کچھ دیگر معاملات ہیں، جیسے کائنات کی اصل یا دیوتاؤں کی پیدائش، جو اندھی علیت کے پابند نظر آتے ہیں اور اس قدر غیر عقلی عناصر سے آلودہ

ہیں کہ انہیں منظّم دلائل کے ذریعے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا جب کوئی موضوع، فلسفیانہ مباحث کی ذیل میں نہیں آتا تو ہمیں ایک بظاہر معقول حکایت سے مطمئن ہونا پڑتا ہے۔[۹۱] مثلاً افلاطون جب روح کے بارے میں لکھتا ہے تو تناسخ ارواح کی پرانی شرقی اسطورہ کی طرف پلٹتا ہے۔[۹۲] ارسطو اتفاق کرتا ہے کہ اگرچہ دیوتاؤں سے متعلق کچھ دیومالائیں صریحاً لغو ہیں، مگر اس روایت کی اساس کہ تمام اولین جواہر دیوتا تھے...... ''حقیقی طور پر الوہی ہے''۔[۹۳]

بنابریں مغربی فکر میں تضاد تھا۔ یونانی ''لوگوس'' اساطیر کی مخالفت کرتا محسوس ہوتا تھا مگر فلسفیوں نے اسطورہ کو کام میں لانا جاری رکھا، یا تو اسے استدلالی فکر کی قدیمی پیش رو سمجھتے رہے یا مذہبی مباحث کیلئے اسے ناگزیر خیال کرتے رہے۔ بلاشبہ، محوری عہد میں یونانی تعقل پسندی کی یادگار کامیابیوں کے باوجود، یونانی مذہب پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یونانیوں نے چھٹی صدی کے ''عوامی عہد'' یعنی عیسوی صدی تک دیوتاؤں کو قربانیاں پیش کرنا، ایلیوسینس کے اسرار میں حصہ لینا اور اپنے جشن منانا جاری رکھا، یہاں تک کہ شہنشاہ جسٹینین نے ان کے مادہ پرستانہ مذہب کو زبردستی دبا دیا اور اسے عیسائیت کے ''مائی تھوس'' سے بدل دیا۔

☆☆☆

www.MashalBooks.org

مابعد محوری عہد

(۲۰۰ ق م تا ۱۵۰۰ء)

اب تک ہم نے اپنے تاریخی جائزے میں ان بڑی بے فکری، روحانی اور سماجی انقلابات پر توجہ مرکوز رکھی ہے جنہوں نے بنی نوع انسان کو اپنی اساطیر پر نظر ثانی کیلئے مجبور کیا۔ محوری عہد کے بعد اگلے ہزاریے میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں ہوئی جس کا موازنہ مذکورہ عہد کی تبدیلی سے کیا جا سکتا ہو۔ ہم اب تک اپنے روحانی اور مذہبی معاملات میں محوری عہد کے حکماء پر انحصار کرتے ہیں اور اسطورہ کی صورتحال بنیادی طور پر سولہویں صدی عیسوی تک ایک جیسی رہی۔ اس تاریخ کے باقی حصے کے جائزے میں ہماری توجہ مغرب پر مرکوز رہے گی، صرف اس لیے نہیں کہ اختراع و ابداع کے اگلے دور کا آغاز یہاں ہوا، بلکہ اس لیے بھی کہ مغربی لوگوں نے پہلے ہی اساطیر کو مشتبہ سمجھنے کا آغاز کر دیا تھا۔ ہم مغربی مذاہب کو بھی توجہ کا مرکز بنائیں گے، کیونکہ تینوں توحیدی مذاہب، کم از کم جزوی طور پر خود کو تاریخی قرار دیتے ہیں اور اساطیری بنیاد کا انکار کرتے ہیں۔ دوسری بڑی روایت، اسطورہ کے سلسلے میں کم کم دو جذتی رویے کی حامل ہیں۔ ہندومت میں تاریخ کو عارضی اور فریب نظر قرار دے کر روحانی توجہ کے ناقابل گردانا گیا ہے۔ ہندو اسطورہ کی آرکی ٹائپل دنیا میں خود کو زیادہ مانوس و مطمئن محسوس کرتے ہیں۔ بدھ مت گہرا نفسیاتی مذہب ہے اور اساطیر کو نفسیات کی ابتدائی شکل کے طور پر دیکھتا اور بالکل حسب منشاء پاتا ہے۔ کنفیوشس مت میں رسومات ہمیشہ، اساطیری بیانوں کے مقابلے میں زیادہ اہم رہی ہیں۔ لیکن یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ان کا خدا تاریخ میں فعال ہے اور اس کا تجربہ اس دنیا کے حقیقی واقعات میں کیا جا سکتا

ہے۔ کیا یہ واقعات حقیقتاً رونما ہوئے یا وہ محض اسطورہ ہیں؟ افلاطون اور ارسطو کے ساتھ ہی اسطور کے سلسلے میں جو پریشان کن رویہ مغربی ذہن کا حصہ بنا، اس کی وجہ سے توحید پرستوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مذہب کو فلسفے کے عقلی معیارات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی، لیکن اکثر اس نتیجے پر پہنچے کہ ایسا کرنا غلطی تھی۔

یہودیت کا دوسرے لوگوں کی اساطیر کی طرف رویہ متناقضانہ تھا۔ یہ دوسری قوموں کی اساطیر کی مخالفت کرتی محسوس ہوتی تھی، مگر بعض اوقات یہودی کشف کے اظہار کے لئے ان غیر ملکی کہانیوں کا سہارا بھی لیتی۔ علاوہ بریں یہودیت نے مزید اساطیر کو متاثر کرنا جاری رکھا۔ ان میں سے ایک عیسائیت تھی۔ یسوع اور ان کے اولین حواری یہودی تھے اور یہودی روحانیت میں رچے بسے تھے، جیسا کہ سینٹ پال، جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے یسوع کو ایک اسطوری شخصیت میں تبدیل کر دیا۔ اس کا مقصود ہجو نہیں ہے۔ یسوع ایک حقیقی تاریکی شخص تھے، جنہیں رومیوں نے ۳۰ء میں مصلوب کیا تھا اور ان کے اولین حواریوں نے یقیناً خیال کیا تھا کہ ایک معنی میں مردہ سے زندہ ہو گئے تھے۔ مگر جب تک ایک تاریخی واقعے کو اسطوری صورت نہیں دے دی جاتی، وہ مذہبی اثر انگیزی کا سرچشمہ نہیں بن سکتا۔ ذرا پیچھے نظر دوڑایئے، اسطورہ ایک واقعہ ہے جو ایک معنی میں ایک مرتبہ واقع ہوا مگر جو ہمیشہ واقع ہوتا ہے۔ ایک وقوعے کو ایک مخصوص وقت کے گھیرے سے آزاد کرانے اور ہم عصر پجاریوں کی زندگی میں لانے کی ضرورت ہوتی ہے، وگرنہ وہ ایک منفرد، دہرائے جانے کے ناقابل واقعہ ہی رہے گا یا ایک تاریخی ترنگ جو حقیقتاً دوسروں کی زندگیوں کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس وقت کیا واقع ہوا تھا جب اسرائیل کے لوگ مصر سے بھاگ نکلے تھے اور ریڈس کا سمندر پار کیا تھا، کیونکہ اس کہانی کو اسطورہ کے طور پر لکھا گیا ہے۔ عہدِ فصح [یہودیوں کا موسم بہار کا تہوار جو یہودی سال کے ساتویں مہینے کی ۱۴ویں تاریخ سے ۲۱ تک بنی اسرائیل کے مصر کی غلامی سے بچ نکلنے کی یاد میں منایا جاتا ہے] صدیوں سے منائی جانے والی رسومات نے اس کہانی کو یہودیوں کی روحانی زندگی میں مرکزی اہمیت دے دی ہے، جنہیں بتایا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو اس نسل میں سے خیال کرنا ضروری ہے جو مصر سے بچ نکلی تھی۔ اسطورہ کو کایا کلپ کرنے والی رسم کے بغیر ٹھیک طرح سے نہیں سمجھا جا سکتا جو اسے پجاریوں کی نسلوں کی زندگیوں اور دلوں میں اتارتی ہے۔ اسطورہ عمل کا تقاضا کرتی ہے۔ خروج کی

www.MashalBooks.org

اسطورہ تقاضا کرتی ہے کہ یہودی، آزادی کی تحسین کی پرداخت ایک مقدس قدر کے طور پر کریں اور خود غلام بننے یا دوسروں کو غلام بنانے سے انکار کریں۔ معمول کی رسم اور اخلاق نتیجے کی بنا پر یہ کہانی اب ماضی بعید کا واقعہ نہیں رہی بلکہ ایک زندہ حقیقت بن گئی ہے۔

یہی کچھ سینٹ پال نے یسوع کے ساتھ کیا۔ وہ یسوع کی تعلیمات میں جن کا حوالہ شاذ و نادر دیتے ہیں، یا ان کی دنیوی زندگی میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ وہ کورنتھ [جنوبی یونان کا قدیم شہر] کے نو عیسائی کو لکھتے ہیں۔ ''اگر ہم حضرت عیسیٰ ؑ کو گوشت پوست کے آدمی کے طور پر جانتے بھی ہوتے تو وہ اس طرح کے نہ ہوتے جس طرح اب ہم انہیں جانتے ہیں۔[۹۴] جو چیز اہم تھی وہ ان کی موت اور دوبارہ جی اٹھنے کا 'اسرار' یعنی مسٹری (ایک ایسا لفظ جو mythos کی مانند یکساں لفظ سے مشتق ہے) تھا۔ پال نے یسوع کو لازمانی، اسطوری ہیرو میں منقلب کر دیا جو موت سے دوچار ہوتا اور نئی زندگی پاتا ہے۔ مصلوب کیے جانے کے بعد یسوع کو خدا منفرد اعلیٰ مرتبہ عطا کرتا ہے اور وہ وجود کی ارفع شان حاصل کرتے تھے۔[۹۵] یسوع اب فقط تاریخی شخصیت نہیں تھے بلکہ عیسائیوں کی زندگیوں کی روحانی حقیقت تھے جو رسوم اور خود یسوع کی طرح بے غرض جینے کے اخلاقی نظم و ضبط کے ذریعے ممکن ہوئی تھی۔[۹۷] عیسائی اب انہیں ''گوشت پوست کے وجود کے'' طور پر نہیں جانتے تھے، بلکہ دوسرے انسانوں، الہامی کتاب کے مطالعے اور عشبائے ربانی میں ان سے دوچار ہوتے تھے۔[۹۸] وہ جانتے تھے کہ اسطورہ سچی ہوتی ہے، مگر تاریخی شہادت کی بنا پر نہیں، بلکہ اس لیے کہ انہوں نے [اسطورہ کے ذریعے] قلب ماہیت کا تجربہ کیا ہوا تھا۔ لہٰذا یسوع کی موت اور 'دوبارہ جی اٹھنا' اسطورہ تھا۔ یہ واقعہ یسوع کو پیش آیا تھا اور اب مسلسل رونما ہو رہا تھا۔

محوری عہد کی وحدانیت کی ایک نئی صراحت عیسائیت نے کی اور دوسرے اسلام نے مسلمان حضرت محمد ؐ (۵۷۰ء۔۶۳۲ء) کو بائبلی پیغمبروں اور حضرت عیسیٰ کا جان نشین سمجھتے ہیں۔ الہامی کتاب قرآن کو، جسے آپؐ عربوں کے لئے لائے، اسطورہ کے سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس کے اجزاء کا ہر ایک حصہ آیت یعنی سبق آموز حکایت (Parable) کہلاتا ہے پیغمبروں جیسے حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ سے متعلق کہانیاں آیات یعنی ''سبق آموز کہانیاں، تمثیلیں'' ہیں، کیونکہ ہم الوہیت کے بارے میں گفتگو اشاروں اور علامتوں ہی میں کر سکتے ہیں۔ عربی لفظ قرآن کا مطلب ''تلاوت'' ہے۔ یہ الہامی

کتاب دنیوی ہدایت نامے کی مانند خاص نجی معلومات کے حصول کیلئے نہیں ہے، بلکہ مسجد کے مقدس ماحول میں اس کی قرأت کی جاتی ہے اور جب تک ایک مسلمان اس کے اخلاقی احکام کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتا، یہ کتاب اپنی مکمل معنویت کا انکشاف نہیں کرتی۔

ان تاریخی مذاہب کی اسطوری جہت کی بنا پر یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں نے مذاہب کی بصیرتوں کو واضح کرنے یا بحران سے نمٹنے کیلئے اساطیر کا استعمال جاری رکھا۔ ان کے تمام صوفیاء اسطورہ سے رجوع کرتے تھے۔ تصوف، اسطورہ اور اسرار کے [انگریزی مترادفات (myth, mysticism اور mystery] الفاظ یونانی musteion سے متعلق ہیں، جس کا مطلب ہے ''آنکھیں یا منہ بند کرنا'' یہ سب ان تجربات سے متعلق ہیں جو مبہم اور امٹ ہیں، کیونکہ وہ گفتار سے ماورا ہیں اور خارجی دنیا کے بجائے داخلی دنیا سے جڑے ہیں۔ تمام صوفیاء نفس (سائیکی) کی گہرائیوں میں سفر کرتے ہیں اور اس کیلئے وہ ارتکاز کے ان ضابطوں کو وسیلہ بناتے ہیں جنہیں تمام مذہبی روایات نے ترقی دی ہے اور جو ہیرو کی اساطیری تلاش کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ چونکہ اساطیر اس مخفی، باطنی جہت کے علم بردار ہیں، اس لیے صوفیاء کے لئے اپنے تجربات کو ان اساطیر میں بیان کرنا فطری ہے، جو بادی النظر میں ان کی [مذہبی] روایت کی مخالف نظر آتی ہیں۔

یہ امر خاص طور پر یہودی عارفانہ روایت قبالہ میں عیاں ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بائبلی مصنفین، بابلی یا شامی اساطیر کے مخالف تھے۔ لیکن قبالیوں نے الوہی ارتقاء کے ایک ایسے عمل کا تصور کیا جو ''اینو ما ایلش'' میں بیان کیے گئے دیوتاؤں کے تدریجی نسب نامہ سے مختلف نہیں۔ ناقابل فہم، پراسرار معبود سے، جسے صوفیا این سوف (En Sof) کہتے ہیں، جس کی کوئی حد نہیں، دس مقدس اعداد (Sefrist) ظاہر ہوئے، یہ دس ظہور اس عمل کے نمائندہ ہیں جس کے ذریعے ''این سوف'' نے اپنی یکتا تنہائی سے نزول کیا اور خود کو بنی نوع انسان پر ظاہر کیا۔[۹۹] ہر ''صفرہ'' (Sefirah) اس کشف و ظہور کا ایک مرحلہ ہے اور اس کا ایک علامتی نام ہے۔ ہر [صفرہ] معبود کے اسرار کو محدود انسانی ذہن کے لئے قابل رسائی بناتا ہے۔ ہر صفرہ خدا کا لفظ ہے، نیز وہ ذریعہ ہے جس سے خدا نے دنیا کو تخلیق کیا۔ آخری 'صفرہ' کو ''شیخناہ'' (Shekhinah) یعنی زمین پر خدا کی الوہی موجودگی، کہا گیا۔ ''شیخناہ'' کو اکثر ایک عورت تصور کیا گیا، یعنی خدا کا تانیثی رخ، کچھ قبالیوں نے الوہیت کے مردانہ اور نسوانی عناصر کو جنسی وصال میں مصروف تصور کیا، جو کاملیت اور بحالی و احیاء

www.MashalBooks.org

کی تمثال ہے۔قبالہ کی بعض صورتوں میں ''شیخناہ'' ایک دلہن کی صورت دنیا میں سرگرداں ہوتی ہے، جو راستہ بھٹک چکی ہے اور معبود سے بیگانہ ہوچکی ہے، الوہی قلمرو سے جلاوطن ہوگئی ہے اور اپنی اصل کی طرف واپسی کی آرزومند ہے۔قانون موسیٰ کی ذمہ دارانہ پابندی کے ذریعے قبالی ''شیخناہ'' کی جلاوطنی ختم کرسکتے ہیں اور دنیا پر خدا کی حاکمیت پھر سے نافذ ہوسکتی ہے۔بائبل کے عہد میں یہودی انات جیسی دیویوں کے معاکی فرقے سے نفرت کرتے تھے جو اپنی الوہی شریک حیات کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھی اور بعل سے اپنے جنسی ملاپ کا جشن مناتی تھی۔لیکن جب یہودیوں نے الوہیت کے اپنے متصوفانہ فہم کو ظاہر کرنے کا طریقہ تلاش کرنے کی کوشش کی تو اسی مذموم کافرانہ اسطورہ کو خاموش یہودی توثیق دے دی گئی۔

قبالہ کا بائبل میں جواز نظر نہیں آتا۔مگر جدید عہد سے پہلے اسے عام طور پر تسلیم کیا گیا کہ اسطورہ کا کوئی ''سرکاری'' متن نہیں۔لوگ نئی اسطورہ گھڑنے یا پرانے اساطیری بیانیے کی انقلابی تعبیر کرنے میں خود کو آزاد محسوس کرتے تھے۔قبالیوں نے بائبل کے لفظی مفہوم کا مطالعہ نہیں کیا۔انہوں نے تفسیر کو فروغ دیا جو بائبلی متن کے ہر ایک لفظ کو ایک یا دوسرے ''عدد'' (Sefrist) سے وابستہ کرتی تھی۔مثلاً کتاب پیدائش کے پہلے باب کی ہر سورت اس واقعے کو بیان کرتی تھی جن کا مثل خدا کی مخفی حیات میں موجود تھا۔قبالیوں نے آفرینش کی ایک نئی اسطورہ گھڑنے کی بھی آزادی محسوس کی، جس کی کوئی مماثلت کتاب پیدائش میں پیش کیے گئے واقعے سے نہیں تھی۔۱۴۹۲ء میں ہسپانیہ سے کیتھولک فرمانروا فرڈیننڈ اور ازابیلا کے ہاتھوں یہودیوں کی جلاوطنی کے بعد اکثر قبالی کتاب پیدائش اول کی تخلیق کی بے ہیجان منظّم اسطورہ سے خود کو ہم آہنگ نہیں کرسکتے تھے، اس لئے قبالی آئزک لہوریا (۱۵۳۴-۱۵۷۲) نے تخلیق کی ایک بالکل مختلف کہانی سنائی، جو جھوٹے ابتدائی اقدامات، الوہی خطاؤں، دھماکوں، متشدد ہزیمتوں اور تباہیوں سے معمور تھی اور جو ناقص تخلیق پر منتج ہوئی۔جہاں ہر شے غلط مقام پر تھی۔بائبلی کہانی سے غیر روایتی انحراف کی بنا پر یہودی لوگوں کو صدمہ پہنچانے سے ہٹ کر، لیوریائی قبالہ ایک عوامی یہودی تحریک بن گئی۔اس نے سولہویں صدی کے یہودیوں کے المیہ تجربے کی عکاسی کی، مگر اس ضمن میں کلی کردار اسطورہ کا نہیں تھا۔لیوریا نے خاص رسومات، مراقبے کے طریقے اور اخلاقی ضابطے وضع کیے، جنہوں نے اسطورہ کو زندہ کردیا اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے یہودیوں کی زندگیوں کی روحانی حقیقت بنادیا۔

عیسائیوں اور مسلمانوں کی تاریخ میں بھی اس سے ملتی جلتی مثالیں ہیں۔مغرب میں جب رومی سلطنت کو زوال ہوا تو جنوبی افریقہ میں ہپو کے بشپ سینٹ آگسٹائن (۳۵۴-۴۳۰) نے آدم و حوا کی اسطورہ کی نئی تعبیر کی اور گناہ اولین کی اسطورہ پیش کی۔آدم کی نافرمانی کی وجہ سے خدا نے پوری نسل انسانی پر ابدی عتاب نازل کیا (اس خیال کی بھی بائبل میں کوئی بنیاد نہیں)۔وراثت میں ملنے والا یہ جرم اس جنسی عمل کے ذریعے تمام نسل انسانی کو منتقل ہوگیا، جو شہوت سے آلودہ تھا اور خدا کی بجائے محض مخلوقات میں مسرت حاصل کرنے کی غیر عقلی خواہش تھا اور یہ پہلے گناہ کا مستقل اثر تھا۔جنسی عمل میں شہوت پوری طرح ظاہر تھی۔جب خدا مکمل طور پر فراموش کردیا جاتا ہے اور مخلوقات بے شرمی کے ساتھ ایک دوسرے میں لذت اٹھاتی ہیں۔یہ عقلی بصیرت، جسے جذباتی ہیجان اور بے مہار جوش کا انتشار روندڈالتا تھا، روم کے منظرنامے سے بری طرح مماثل تھی جو مغرب میں عقلیت، قانون اور نظم کا سرچشمہ تھا اور جسے وحشی قبائل نے بے حیثیت کردیا تھا۔مغربی عیسائیوں نے اکثر گناہ اولین کو اپنے عقیدے کا لازمی حصہ سمجھا ہے، مگر بازنطین کے راسخ العقیدہ یونانیوں نے جہاں روم کا زوال واقع نہیں ہوا، اس عقیدے کی کبھی توثیق نہیں کی، نہ انہوں نے اس بات کا یقین کیا کہ یسوع نے گناہ اولین کے اثرات سے ہمیں نجات دلانے کیلئے جان دی۔نیز انہوں نے زور دے کر کہا کہ اگر آدم گناہ کے مرتکب نہ ہوتے تو خدا انسان بن جاتا۔

اسلام میں بھی صوفیاء نے خدا سے ہجر اور وصال کی اسطورہ تشکیل دی۔یہ کہا گیا کہ حضرت محمدؐ نے یروشلم کے مقدس مقام سے خدا کے تخت تک عارفانہ معراج پائی۔یہ اسطورہ مسلم روحانیت کا آرکی ٹائپ بن گئی ہے اور صوفی اس اسطورہ کو پیغمبرؐ کے اسلام کے مکمل عمل یا خدا کی اطاعت، کی علامت کے لئے بروئے کار لاتے ہیں۔شیعی مسلمانوں نے پیغمبرؐ کی مرد اولاد کا اساطیری نظریہ وضع کیا، جو ان [شیعوں] کے امام (رہنما) تھے۔ہر امام الوہی علم کی تجسیم تھا۔جب اماموں کا سلسلہ باقی نہ رہا تو انہوں نے کہا کہ آخری امام ''احتجاب'' کی حالت میں چلے گئے اور ایک دن آئے گا جب وہ انصاف اور امن کے نئے عہد کا آغاز کرنے کیلئے واپس آئیں گے۔اس مقام پر شعیت بنیادی طور پر ایک عارفانہ تحریک تھی اور عبادت کے خصوصی طریقوں اور روحانی تفسیر کے بغیر، اس اسطورہ کا کوئی مطلب نہیں تھا۔شیعہ اپنی اساطیر کی لفظی تعبیر ہرگز نہیں چاہتے تھے۔امامت کی اسطورہ، جو مسلم راسخ العقیدگی کا مذاق اڑاتی محسوس ہوتی ہے، اس مقدس موجودگی کے عارفانہ

www.MashalBooks.org

مفہوم کو ظاہر کرنے کا علامتی طریقہ تھی، جو ہر شے میں جاری وساری ہے اور شورش زدہ اور خطرناک دنیا میں قابل رسائی ہے۔ روپوش امام اسطورہ بن گئے تھے، روزمرہ کی تاریخ سے الگ کیے جانے کے بعد وہ زمان ومکان کی حد بندیوں سے آزاد ہو گئے اور منافقانہ طور پر جب عباسی خلیفہ کے حکم سے انہیں گھر پر نظر بند کیا گیا تو شیعوں کی زندگی میں ان کی موجودگی کہیں زیادہ شوخ اور روشن ہو گئی۔ یہ کہانی بتاتی ہے کہ متبرک (ہستی) سے متعلق ہمارا فہم کس قدر گریز پا اور دنیا میں ترساتے ہوئے غیر موجود ہے، مگر دنیا سے نہیں۔

لیکن چونکہ ''میتھوس'' اور ''لوگوس'' کی وہ تقسیم، جس کا تجربہ یونانیوں، بعض یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں نے کیا، ان کی روایات میں بھرپور اساطیر آمیزش کے سلسلے میں پریشان کن تھی۔ جب آٹھویں اور نویں صدیوں میں افلاطون اور ارسطو کے عربی تراجم ہوئے تو کچھ مسلمانوں نے قرآن کے مذہب کو ''لوگوس'' (تعقل) کا مذہب بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے ارسطو کی علت اولی کی تصریح کو بنیاد بناتے ہوئے اللہ کے وجود کے ''ثبوت'' تشکیل دیئے۔ ان فیلسوف نے جیسا کہ انہیں کہا گیا، اسلام کو ابتدائی دور کے اساطیری عناصر سے پاک کرنا چاہا۔ ان کا کام سخت مشکل تھا، کیونکہ فلسفیوں کا خدا دنیوی واقعات پر توجہ نہیں دیتا تھا، تاریخ میں خود کو ظاہر نہیں کرتا تھا، اس نے دنیا کو پیدا نہیں کیا تھا اور یہاں تک کہ بے خبر تھا کہ بنی نوع انسان موجود ہیں۔ بایں ہمہ ان فیلسوف نے اسلامی مملکت میں ان یہودیوں سے مل کر کچھ دلچسپ کام کیا، جنہوں نے بائبل کے مذہب کو تعقل پسند بنانے کا بیڑہ اٹھایا تھا، تاہم فلسفہ اقلیتی سرگرمی ہی رہا، قلیل دانش ورانہ جماعت تک محدود رہا، علت اولیٰ، بائبل اور قرآن کے خدا کے مقابلے میں زیادہ منطقی ہوسکتی ہے، مگر اکثر لوگوں کے لئے مشکل ہے کہ وہ اس معبود میں کوئی دلچسپی پیدا کریں جو ان سے اس قدر بے نیاز ہو۔

یہ بات معنی خیز ہے کہ راسخ العقیدہ یونانی عیسائی اس عقلی منصوبے سے متنفر تھے۔ وہ اپنی یونانی روایت سے واقف تھے اور یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ''لوگوس'' (تعقل) اور ''میتھوس'' جیسا کہ افلاطون واضح کر چکے تھے، خیر کے وجود کو ثابت نہیں کر سکتے۔ ان کی نظر میں دینیات کا مطالعہ ایک عقلی مشق نہیں ہوسکتا۔ الوہیت پر بحث کرتے ہوئے عقل کا استعمال کرنا اسی طرح بے نتیجہ ہے، جس طرح کانٹے کی مدد سے سوپ کھانے کی کوشش کرنا، دینیات اسی صورت

میں معقول تھی، جب اس کا مطالعہ دعا اور باجماعت عبادت کو ملا کر کیا جائے۔ بالآخر مسلمان اور یہودی یکساں نتیجے پر پہنچے۔ گیارہویں صدی تک مسلمان فیصلہ کر چکے تھے کہ فلسفے کا امتزاج روحانیت، رسوم اور عبادت سے کیا جانا ضروری ہے اور انیسویں صدی کے آخر تک صوفیاء کا اساطیری عارفانہ مذہب، اسلام کی معیاری صورت اختیار کر چکا تھا۔ اسی طرح یہودیوں نے دریافت کیا کہ جب انہیں ہسپانیہ سے بے دخلی جیسے المیوں کو سنہا پڑا تو ان کے فلسفیوں کا عقلی مذہب ان کی مدد نہیں کرسکتا تھا، لہٰذا وہ اس کی بجائے قبالہ کی اساطیر کی طرف متوجہ ہوئے، جس تک رسائی ذہن کی فکری سطح کے ذریعے ہوئی مگر جس نے ان کے کرب اور تڑپ کے داخلی سرچشمے کو مس کیا۔ وہ سب اس قدیم تصور کی طرف راجع ہوئے جس میں اساطیر اور عقل ایک دوسرے کا تکملہ تھے۔ طب، ریاضی اور فطری سائنس کی دنیا میں جس میں مسلمانوں نے خاص طور پر نام پیدا کیا، ''لوگوس'' ناگزیر تھی، لیکن جب انہوں نے اپنی زندگیوں میں حتمی معنی اور معنویت تلاش کرنا چاہا، جب اپنی یاسیت کو کم کرنے کی سعی کی یا اپنی شخصیت کے داخلی منطقوں کو کھوجنے کی خواہش کی تو وہ اسطور کی قلمرو میں داخل ہو گئے۔

لیکن گیارہویں اور بارہویں صدیوں میں، مغربی یورپ کے عیسائیوں نے افلاطون اور ارسطو کی کتابوں کی بازیافت کی، جو عہد مظلمہ میں ان سے کھو گئی تھیں اور جس کے بعد رومی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ ٹھیک اسی لمحے جب یہودی اور مسلمان اپنی اساطیر کی عقلی توجیہات کی کوششوں سے ہاتھ کھینچنے کا آغاز کر رہے تھے، مغربی عیسائیوں نے اس منصوبے کو ایک ایسے جوش سے اختیار کر لیا جسے کبھی سرد نہیں ہونے دیا۔ وہ اسطور کے معنی سے ربط ضبط ختم کرنے کا آغاز کر چکے تھے۔ اس لیے شاید یہ بات حیران کن نہیں کہ انسانی تاریخ میں اگلی عظیم کایا کلپ، جس نے لوگوں کیلئے اسطوری طور پر سوچنا بے حد مشکل بنا دیا تھا، اس کا منبع مغربی یورپ تھا۔

☆☆☆

www.MashalBooks.org

عظیم مغربی کایا کلپ

۱۵۰۰ء تا ۲۰۰۰ء

سولہویں صدی کے دوران میں، تقریباً آزمائشی، تجربات کے ذریعے، یورپ کے لوگ اور بعدازاں جسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ بننا تھا وہاں کے لوگ ایک ایسی تہذیب کی تخلیق کا آغاز کر چکے تھے، جس کی مثال تاریخ عالم میں موجود نہیں تھی، اور انیسویں اور بیسویں صدیوں میں جسے کرۂ ارض کے دوسرے حصوں میں پھیلنا تھا۔ انسانی تجربے میں عظیم انقلابات میں سے یہ آخری تھا، زراعت کی دریافت یا شہر کی ایجاد کی مانند اس کا بھی گہرا اثر ہونا تھا، جس کے نتیجے کو سمجھنے کا آغاز ہم اب کر رہے ہیں۔ پہلے کی طرح کی زندگی کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی اور اس تجربے کا شاید سب سے زیادہ معنی خیز اور داخلی طور پر تباہ کن نتیجہ اساطیر کی موت تھا۔

مغربی جدیدیت ''لوگوس'' (تعقل) کی اولاد ہے۔ اس کی تعمیر ایک مختلف معاشی اساس پر اٹھائی گئی۔ فاضل زرعی پیداوار پر انحصار کرنے کے بجائے، جیسا کہ عام قبل جدید تہذیبوں میں (یہ انحصار) ہوتا تھا، نئے مغربی معاشروں کی بنیاد، وسائل کو ٹیکنالوجی کی مدد سے بار بار پیدا کرنے اور سرمائے کی مستقل باز سرمایہ کاری پر رکھی گئی۔ اس نے جدید معاشرے کو ان روایتی ثقافتوں کی بہت سی بندشوں سے آزادی دلائی جن کی زرعی بنیاد ناگزیر طور پر غیر یقینی ہوتی تھی۔ اب تک ایک ایجاد یا خیال کو، جس کیلئے زرِ کثیر درکار ہوتا تھا، ملتوی کر دیا جاتا تھا، کیونکہ ہمارے اپنے معاشرے سے پہلے کوئی معاشرہ اس بنیادی ڈھانچے (انفراسٹرکچر) کی لامحدود نقل کرتے چلے جانے سے قاصر تھا جواب ہمارے لیے معمول کی بات ہے۔ زرعی معاشرے ضرر پذیر تھے، کیونکہ وہ کٹائی اور زمین کی

فرسودگی جیسے تغیر پذیر عوامل پر انحصار کرتے تھے۔ اگر ایک سلطنت اپنی مالی قراردادوں کو پھیلاتی اور بڑھاتی تو اس کی معاشی بنیاد کا کمزور ہو جانا یقینی ہوتا۔ مگر مغرب نے ایک ایسی معیشت کو فروغ دیا جو اپنی نہاد میں لامحدود طور پر قابل تجدید محسوس ہوتی تھی۔ مغربی لوگوں نے ماضی کی طرف دیکھنے اور اب تک کے حاصلات کو آئندہ کیلئے محفوظ کرنے جیسا کہ قبل جدید تہذیبوں کی عادت تھی، کے بجائے آگے دیکھنا شروع کیا۔ جدیدکاری کا عمل، جس کیلئے یورپ کو تین صدیاں لگیں، گہری تبدیلیوں کے سلسلے پر مشتمل تھا، صنعت کاری، زراعت میں انقلابی تبدیلی اور معاشرے کی تنظیم کیلئے سیاسی اور سماجی انقلابات اور دانش وران ''روشن خیالی'' جس نے اسطور کو بے کار، جھوٹی اور از کار رفتہ قرار دے کر رسوا کیا۔

مغربی کارنامے کا انحصار نتائجیت پسند، سائنسی روح پر تھا۔ لیاقت نیا نعرہ تھا۔ ہر شے کو بروئے کار آنا پڑا۔ نئے خیال یا ایجاد کے لئے ضروری تھا کہ وہ عقلی ثبوت کے لئے موزوں ہو اور اس کی خارجی دنیا سے مطابقت ظاہر کی جا سکے۔ اسطور کے برعکس، ''لوگوس'' لازماً حقائق سے مطابقت اختیار کرتا ہے، یہ بنیادی طور پر عملی ہے، یہ ایسا طرزِ فکر ہے جسے ہم اس وقت استعمال کرتے ہیں جب ہم کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس کی نظر برابر آگے کی طرف رہتی ہے، تاکہ ہم اپنے ماحول پر زیادہ سے زیادہ قابو پا سکیں یا کوئی نئے شے دریافت کر سکیں۔ لہٰذا مغربی معاشرے کا نیا ہیرو سائنس دان یا موجد تھا جو اپنے معاشرے کی خاطر انجانی دنیاؤں کی مہم جوئی کر رہا تھا۔ اسے اکثر قدیم حرمتوں کا خاتمہ کرنا پڑتا۔ بالکل جس طرح محوری عہد کے حکماء کو کرنا پڑا تھا۔ لیکن مغربی جدیدیت کے ہیرو ''لوگوس'' کی ٹیکنالوجی اور سائنس کے نابغوں کو ہونا تھا، نہ کہ ''میتھوس'' سے وہبی تحریک پانے والے روحانی نابغوں کو۔ اس کا مطلب فکر کے وجدانی، اساطیری طریقوں کو، سائنسی عقلیت کی زیادہ نتائجیت پسند، منطقی روح کے حق میں نظرانداز کر دیا جانا تھا۔ چونکہ اکثر مغربی لوگوں نے اسطور سے کام نہیں لیا۔ اس لیے بہت سوں نے اس تمام مفہوم کو کھو دیا جس کی یہ حامل تھی۔

ایک نئی رجائیت مغرب میں تھی۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ انہیں اپنے ماحول پر زیادہ قدرت حاصل ہے۔ مقدس، ناقابل تفسیر قوانین اب باقی نہیں رہے تھے۔ وہ اپنی سائنسی دریافتوں کی بدولت فطرت کو حسب منشا ڈھال سکتے اور اپنی قسمت سنوار سکتے تھے۔ جدید طب، حفظان صحت،

www.MashalBooks.org

محنت کی بچت کی تیکنیکوں اور رسل و وسائل کے بہتر طریقوں کی دریافت نے مغربی لوگوں کی زندگی میں بہتری کا انقلاب برپا کر دیا۔ مگر ''لوگوس'' بنی نوع انسان کو وہ معنویت مہیا کرنے کے کبھی قابل نہ ہوا، جس کے وہ طالب محسوس ہوتے تھے۔ یہ اسطور ہی تھا جس نے زندگی کو تنظیم اور معنی دے رکھے تھے، مگر جیسے جدید کاری کی رفتار بڑھی اور ''لوگوس'' نے اتنے نمایاں نتائج دکھائے، اساطیر اسی تیزی سے نامعتبر ہوتی چلی گئی۔ سولہویں صدی کے اوائل ہی سے جب پرانا اساطیری طرز فکر زائل ہوا اور اس کی جگہ لینے کیلئے کچھ سامنے نہ آیا تو ہمیں شل کر دینے والی افسردگی، سرایت گیر ذہنی اضمحلال اور بے چارگی اور غیظ و غضب کے احساس کی زیادہ سے زیادہ علامات نظر آنے لگتی ہیں۔ ہم آج وہی عام اخلاقی معیار کی کمی ترقی پذیر ملکوں میں دیکھ رہے ہیں جو ابھی تک جدید کاری کے ابتدائی مراحل میں ہیں۔

سولہویں صدی میں یہ بیگانگی ان مصلحین کے ہاں عیاں تھی جنہوں نے یورپی مذہب کو مزید سادہ، موثر اور جدید بنانے کی کوشش کی۔ مارٹن لوتھر (۱۴۸۳۔۱۵۵۶) اذیت ناک افسردگی اور اچانک بے لگام اشکال کا شکار ہوئے۔ الرخ سیونگلی (۱۴۸۵۔۱۵۳۰) اور جون کیلون (۱۵۰۹۔۱۵۶۴) دونوں کو لوتھر کی طرح انسانی وجود کی آزمائشوں کے آگے مکمل بے بسی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ایک ایسا مرض تھا جس نے انہیں اس کے مداوے کی تحریک دی۔ ان کی اصلاح شدہ عیسائیت نے واضح کیا کہ طلوع ہوتی جدید روح کس قدر اساطیری شعور کی مخالف ہے۔ قبل جدید مذہب میں مشابہت کو شناخت کے طور پر تجربہ کیا گیا۔ لہٰذا علامت اس حقیقت سے متحد تھی جس کی وہ نمائندگی کرتی تھی، مصلحین کے مطابق اب عشائے ربانی جیسی رسم 'صرف' علامت تھی۔ بنیادی طوری پر ایک جدا شے، کسی بھی قبل جدید رسم کی مانند، حضرت عیسیٰؑ کی کفارے کی موت کو عوام الناس نے دہرایا جو اساطیری ہونے کی وجہ سے لازمانی تھی اور اسے ایک زندہ، حاضر حقیقت بنا دیا۔ مصلحین کے لئے یہ ایک گزرے واقعے کی محض یادگار تھی۔ الہامی کتاب پر ایک نئے قسم کا اصرار تھا، مگر طباعت کی جدید ایجاد اور نئی طول و عرض میں پھیلی خواندگی نے مقدس متن سے متعلق لوگوں کا ادراک بدل دیا۔ خاموش، خلوت کی قرات کی جگہ جماعتی قرات نے لے لی۔ لوگ اب بائبل کو زیادہ تفصیل سے سمجھ سکتے تھے اور خود اپنی آراء قائم کر سکتے تھے، مگر اب اس کی قرات رسوماتی تناظر میں نہیں کی جاتی تھی۔ اس تک رسائی، کسی بھی دوسرے جدید متن کی طرح واقعاتی معلومات

کے حصول کیلئے سیکولر انداز میں آسان تھی۔

زندگی کی بہت سی چیزوں کی طرح، جدید دریافتوں میں سے اکثر مشتبہ اور غیر یقینی تھیں۔ نئی فلکیات نے کائنات کا مبہوت کر دینے والا تصور متعارف کروایا۔ نیکولس کوپرنیکس (۱۴۷۳۔۱۵۴۳) نے اپنی سائنسی تحقیقات کو مذہبی سرگرمی کے طور پر دیکھا، جس نے اسے ہیبت زدہ کر دیا، لیکن اس کے نتائج پریشان کن تھے، اسطورہ نے بنی نوع انسان کو یقین دلا رکھا تھا کہ وہ کائنات کے جوہر سے ہم رشتہ ہیں، تاہم اب معلوم ہوا کہ ایک چھوٹے ستارے کے گرد چکر لگاتے ایک غیر نمایاں سیارے پر وہ محض حاشیائی مقام رکھتے ہیں۔ اب وہ اپنے ادراک پر بھروسہ نہیں کر سکتے، کیونکہ زمین جو جامد نظر آتی ہے، وہ اصل میں تیزی سے حرکت کر رہی ہے۔ [ایک طرف] خود اپنے خیالات پیدا کرنے کیلئے ان کی روز افزوں حوصلہ افزائی ہو رہی تھی۔ مگر [دوسری طرف] وہ زیادہ سے زیادہ جدید 'ماہرین' کے اسیر تھے کہ فقط وہی اشیاء کی ماہیت کا راز افشا کر سکتے تھے۔

برطانیہ میں فرانسیس بیکن (۱۵۶۱۔۱۶۲۶) نے آزادی کا اعلان نامہ تیار کیا، سائنس کو اساطیر کی ہتھکڑیوں سے نجات دلانے کے لئے اپنی کتاب ''علم کی ترقی'' (Advancement of Learning) (مطبوعہ ۱۶۰۵) میں اس نے نئے اور شاندار عہد کا اعلان کیا۔ سائنس انسانی ابتلا کا خاتمہ کر دے گی اور دنیا کو بچا لے گی۔ اس ترقی کی راہ میں کچھ حائل نہ ہو۔ مذہب کی تمام اساطیر کو سخت گیر تنقید کا موضوع بنایا جانا چاہیے اور اگر وہ ثابت شدہ حقائق کی تردید کرتی ہیں تو انہیں مسترد کر دیا جائے۔ صرف عقل ہی اس سچائی تک پہنچا سکتی ہے۔ اس تجربی مزاج کو جس پہلے سائنس دان نے پورے طور پر جذب کیا، وہ غالباً سر اسحاق نیوٹن (۱۶۷۲۔۱۷۳۷) ہے، اس نے تجربے اور استقراء کے ابھرتے ہوئے سائنسی علوم کے کم و کاست استعمال سے اپنے پیش رووں کی تحقیقات کو مربوط کیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کو دنیا سے متعلق بے مثال اور یقینی معلومات مہیا کر رہا ہے، یہ کہ جس کونیاتی نظام کو اس نے دریافت کیا ہے وہ مکمل طور پر حقائق سے مطابقت رکھتا ہے، نیز یہ کہ اس سے خدا کا وجود ثابت ہوتا ہے ایک عظیم ''مکینک'' جو کائنات کی پچیدہ مشین کو وجود میں لایا ہے۔

''لوگوس'' میں پوری طرح غرق ہو جانے سے، نیوٹن کیلئے ادراک کی وجدانی طرزوں کی پذیرائی ناممکن ہو گئی تھی۔ اس کیلئے اساطیر اور سریت، تہذیب کے ابتدائی دور کے ناپختہ طریقے

www.MashalBooks.org

تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ عیسائیت کو تثلیث جیسے عقائد سے پاک کرنا جو منطق کے قوانین کی نفی کرتے ہیں، اس کا مشن ہے۔ وہ یہ سمجھنے کے بالکل قابل نہیں تھا کہ یہ عقیدہ چوتھی صدی کے یونانی دینیاتی علماء نے ایک اسطور کے طور پر ٹھیک اسی طرح وضع کیا تھا، جس طرح یہودی قبالیوں نے جیسا کہ نائیسا کے بشپ گریگوری (۳۳۵۔۳۹۵) واضح کر چکے ہیں کہ باپ، بیٹا اور روح القدس معروضی وجود پاتی حقائق نہیں، بلکہ محض ایسی اصطلاحیں ہیں، جنہیں ہم اس قرینے کو ظاہر کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں، جس کے ذریعے نام اور گفتار سے بالا الوہی فطرت خود کو انسانی ذہن کی معذوریوں سے ہم آہنگ کرتی ہے۔[۱۰۰] آپ عقلی ذرائع سے تثلیث کا وجود ثابت نہیں کر سکتے۔ اسے موسیقی یا شاعری کے گریز پا معنی کی طرح منطقی طرز پر ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر نیوٹن عقلی طور پر ہی تثلیث سے معاملہ کر سکتا تھا۔ اگر کوئی چیز منطقی طور پر واضح نہیں کی جا سکتی تو یہ باطل تھی۔ ''مذہب کے معاملے میں انسانیت کا یہ گرم، غصیلا مزاج اور توہم پرستانہ حصہ ہے۔ جو ہمیشہ پراسراریت کا شائق رہا ہے اور اسی بنا پر اس شے کو سب سے زیادہ پسند آتا ہے، جسے سب سے کم سمجھتا ہے''۔[۱۰۱] اس نے شک مزاجی سے لکھا۔ آج کے ماہرین کونیات نیوٹن کے عقلی خدا پر یقین نہیں رکھتے، مگر اکثر مغربی لوگ عقل کی فوقیت اور مذہبی معاملات میں بھی اسطور کے سلسلے میں اس کے خلجان میں شریک ہیں۔ نیوٹن کی طرح وہ سوچتے ہیں کہ خدا کو معروضی، منطقی طور پر ثابت کی جا سکنے والی حقیقت ہونا چاہیے۔ چنانچہ مغربی عیسائیوں کی قابل لحاظ تعداد تثلیث کے سلسلے میں مسائل کا شکار ہے۔ نیوٹن کی طرح وہ یہ بات سمجھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں کہ تثلیثی اسطور کی تشکیل کا مقصد عیسائیوں کو یاد دلانا تھا کہ انہیں الوہیت کو عام فہم شخصیت کے طور پر سوچنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے۔[۱۰۲]

سائنسی لوگوس اور اسطور ایک دوسرے کی ضد بنتی جا رہی تھیں۔ اب ایک سائنس پر عمل جامع اساطیر کے اندر ہو رہا تھا جو اس کی معنویت کو واضح کرتی تھیں۔ فرانسیسی ماہر ریاضی بلیسی پاسکل (۱۶۲۳۔۱۶۶۲) گہرے طور پر مذہبی آدمی تھا۔ جب اس نے جدید سائنس کی دریافت کردہ لامحدود کائنات کے ''ابدی سکوت'' پر تأمُّل کیا تو ہیبت زدہ ہو کر رہ گیا۔

''جب میں آدمیوں کی بے مقصد اور بے ہودہ صورتحال دیکھتا ہوں، جب میں پوری کائنات کا جائزہ لیتا اور اسے مردہ پاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ

آدمی تنہا ہے، بغیر روشنی کے، جیسے وہ کائنات کے اس کونے میں بھٹک گیا ہو، یہ جانے بغیر کہ کس نے اسے یہاں لا پھینکا اسے کیا کرنا ہے یا اس کا کیا بنے گا جب وہ مرے گا، کچھ بھی جاننے کے وہ ناقابل ہے......تو مجھ پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے، اس آدمی کی طرح جسے دوران نیند کسی دہشت ناک صحرائی جزیرے میں پہنچا دیا گیا ہو، جاگنے پر جس کے حواس مکمل طور پر گم ہو چکے ہوں اور بچنے کی کوئی صورت نہ ہو۔ پھر مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ اس قدر بدبختی و نامرادی کی صورت حال بھی لوگوں پر مایوسی طاری نہیں کرتی۔[۱۰۳]

اس قسم کی بیگانگی جدید تجربے کا حصہ رہی ہے۔

اٹھارویں صدی کی روشن خیالی کے دوران میں تاریکی چھٹتی محسوس ہوئی۔ جون لاک (۱۶۳۲۔۱۷۰۴) نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مقدس ہستی کے وجود کو ثابت کرنا ناممکن ہے مگر اسے شک نہیں تھا کہ خدا وجود رکھتا ہے اور انسانیت مزید محکم عہد میں داخل ہو چکی ہے۔ روشن خیالی کے جرمن اور فرانسیسی فلسفیوں نے پرانے سری اور اساطیری مذاہب کو ازکار رفتہ سمجھا۔ یہی رائے برطانوی دینیاتی عالم جون نولینڈ (۱۶۷۰۔۱۷۲۲) اور میتھیو ٹینڈال (۱۶۵۵۔۱۷۳۳) کی تھی۔ تنہا 'لوگوس' ہمیں سچائی تک پہنچا سکتا ہے اور عیسائیت کو پراسرار اور اساطیری عناصر سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ پرانی اساطیر کی اس طور تعبیر کرنے کا آغاز ہوا، جیسے وہ تعقلات (logori) ہوں۔ یہ ایک مکمل طور پر نئی پیش رفت تھی جس کا ناکام ہونا طے تھا، کیونکہ یہ کہانیاں واقعاتی نہ تھیں، نہ کبھی رہی تھیں۔

تاہم متناقضانہ طور پر عقلیت کے دور نے غیر عقلیت پسندی کے پھوٹ پڑنے کا مشاہدہ کیا۔ سولہویں اور سترھویں صدی کے چڑیلوں کے عظیم خبط نے، جو یورپ کے بہت سے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ملکوں میں ہمہ گیر فیشن بن گیا تھا، واضح کیا کہ سائنسی عقلیت ہمیشہ ذہن کی تاریک قوتوں کو نہیں روک سکتی۔ چڑیلوں کا خبط اجتماعی عفریتی فینٹاسی تھا جس نے ہزاروں مردوں اور عورتوں کو سزائے موت اور اذیت سے ہمکنار کیا۔ لوگوں کا اعتقاد تھا کہ چڑیلیں، بھوتوں سے جنسی تعلق قائم کرتی ہیں اور شیطانی عیش و مستی کی مجلسوں میں شریک ہونے کیلئے ہواؤں میں اڑتی

www.MashalBooks.org

پھرتی ہیں۔لوگوں کے لاشعوری خوف کو بغیر موثر اساطیر کے واضح کرنے کی کوشش میں انہوں نے ان خوفوں کی توجیہہ 'امر واقعہ' کے طور پر کی۔ خوف زدہ اور تباہ کن غیر عقلیت ہمیشہ سے انسانی تجربے کا حصہ رہی ہے اور اب بھی ہے۔ یہ ان نئی عیسائی تحریکوں میں شدت سے ظاہر ہوئی جنہوں نے روشن خیالی کے آدرشوں کو مذہبی صورت میں ڈھالنے کی کوشش کی۔عرف عام میں ''عیسائی جمعیت'' [یعنی Qvakor، اس جماعت کے افراد امن پسند، روایتی عقائد و رسوم سے گریزاں اور کلیسائی منصبوں کے خلاف تھے] یہ افراد تھے، کیونکہ وہ اپنی صحبتوں میں تھرتھراتے، عف عف کرتے، چیختے چلاتے تھے، پیورٹن بھی، جن میں سے زیادہ تر کامیاب سرمایہ دار اور اچھے سائنس دان تھے، ہنگامہ خیز روحانیت اور کایا کلپ کے دہشت ناک تجربات کے حامل تھے، جنہیں اکثر برقرار رکھنے سے قاصر رہتے تھے۔ان کی اچھی خاصی تعداد افسردگی کی حالت کا شکار ہو جاتی تھی اور بعض تو خودکشی تک کر لیتے تھے۔ [۱۰۴] یہی علامات مرض نیو انگلینڈ میں پہلی عظیم بیداری (۱۷۳۴-۱۷۴۰) کے دوران میں نظر آتی ہیں۔ ہر ایک شخص عارف بننے اور متبادل نفسیاتی حالتیں حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر سریت کی اعلیٰ ترین حالتیں ہر کہ دمہ کے لئے نہیں تھیں۔اس کے لئے خاص قسم کی صلاحیت، مزاج اور دو بہ دو تربیت درکار تھی۔ غیر تربیت یافتہ، اناڑی افراد کا گروہی تجربہ، عوامی ہسٹیریا اور یہاں تک کہ ذہنی امراض کا باعث بن سکتا تھا۔

انیسویں صدی تک یورپ کے لوگ یہ خیال کرنے لگے تھے کہ مذہب اصل میں ضرر رساں ہے۔ لڈوگ فیورباخ (۱۸۰۴-۱۸۷۳) کی دلیل تھی کہ مذہب لوگوں کو ان کی انسانیت سے بیگانہ کرتا ہے اور کارل مارکس (۱۸۱۸-۱۸۸۳) نے مذہب کو بیمار معاشرے کی علامت سمجھا۔ نیز بلا شبہ اس عہد کا اساطیری مذہب، غیر صحت مندانہ تصادم پیدا کر سکتا تھا، یہ سائنسی عہد تھا اور لوگ اس امر کا یقین کرنا چاہتے تھے کہ ان کی روایات نئے دور کے مطابق ہیں، لیکن اگر آپ یہ سوچیں کہ ان اساطیر کو ان کے لفظی معنی میں سمجھنا چاہیے تو مذکورہ یقین حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چالیس ڈارون (۱۸۰۹-۱۸۸۲) کی شائع کردہ The Origin of Species (۱۸۵۸) سے ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔اس کتاب کا مقصد مذہب پر حملہ نہیں سائنسی مفروضے کی سنجیدہ تحقیق تھا۔لیکن چونکہ اس وقت لوگ کتاب پیدائش کے آفرینش عالم کے نظریے کا مطالعہ اس طور کر رہے تھے جیسے یہ حقائق پر مبنی ہو، اس لئے اکثر عیسائیوں نے محسوس کیا اور اب تک محسوس کرتے ہیں کہ

ایمان کی پوری عمارت خطرے میں تھی۔تخلیق سے متعلق کہانیوں کو کبھی تاریخی طور پر صحیح نہیں سمجھا گیا تھا، ان کا مقصد شفا بخشی تھا، لیکن ایک مرتبہ جب آپ کتاب پیدائش کو سائنسی اعتبار سے معقول ہونے کے طور پر پڑھنے کا آغاز کرتے ہیں تو آپ کے ہاتھ خراب سائنس اور خراب مذہب ہی آتے ہیں۔

نئی تنقید عالیہ نے جس نے جدید سائنسی منہاج کا خود بائبل پر اطلاق کیا، واضح کیا کہ بائبل کو لفظ کے لغوی معنی کی سطح پر پڑھنا ناممکن ہے۔اس کے بعض دعوے صاف طور پر نادرست تھے۔مثلاً تورات کے پہلے پانچ ابواب، حضرت موسیٰؑ نے نہیں بلکہ کافی عرصے بعد مختلف مصفنین کی جماعت نے لکھے، کنگ ڈیوڈ نے کتاب الادعیہ تصنیف نہیں کی تھی اور زیادہ تر معجزاتی کہانیاں ادبی استعارے تھیں۔ بائبلی کہانیاں 'اسطورہ' تھیں اور عوامی محاورے ہیں ان کا مطلب تھا کہ وہ سچی نہیں ہیں۔تنقید عالیہ اب تک پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں کا پرہول واہمہ (bugbear) ہے، جن کا دعویٰ ہے کہ بائبل کا ہر لفظ، لغوی، سائنسی اور تاریخی اعتبار سے سچا ہے...... یہ ایک ایسا پھس پھسا موقف ہے جو تردیدی اور دفاعی مناظرے کا باعث ہے۔

لگتا ہے انیسویں صدی کے آخر تک ''لوگوس'' اور ''مائتھوس'' کا انقطاع مکمل ہو گیا۔ تھامس اینچ ہکسلے (۱۸۲۵-۱۸۹۵) جیسے معرکہ آراؤں کا ماننا تھا کہ لڑائی ان کے اپنے اختیار میں ہے۔لوگوں کو اساطیر اور عقلی سائنس میں ایک کا انتخاب لازماً کرنا ہے اور [دونوں میں] کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔صرف عقل ہی سچائی کی حامل تھی اور مذہب کی اساطیر سچائی سے خالی تھیں۔ لیکن سچائی کو اس تک محدود کر دیا گیا جو ''منطقی طور پر ثابت تھی اور منطقی طور پر ثابت کی جا سکتی تھی''۔ [۱۰۵] جو مذہب کے سوا، آرٹ اور موسیقی کے ذریعے بیان کی گئی سچائیوں کو بھی خارج رکھے گی۔ اسطورہ کو عقلی موضوع بنا کر جدید سائنس دانوں، نقادوں اور فلسفیوں نے اسے ناقابل یقین بنا دیا۔ فریڈرخ نطشے (۱۸۴۴-۱۹۰۰) نے ۱۸۸۲ میں اعلان کیا کہ خدا مر گیا ہے۔ایک لحاظ سے وہ صحیح کہہ رہا تھا، اسطورہ، مسلک، رسوم اور اخلاقی زندگی کے بغیر الوہیت کا مفہوم فنا ہو جاتا ہے۔ جدید مردوں اور عورتوں نے خدا کو مکمل طور پر ایک نظری سچائی بنا کر، جس تک رسائی فقط تعقل کے ذریعے ممکن ہے، اپنے لئے مار دیا تھا ''زندہ دل سائنس'' (The Gay Science) نطشے کی حکایت کا پاگل یقین رکھتا تھا کہ خدا کی موت نے انسانیت کو اس کی جڑوں سے الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ ''کیا اب

www.MashalBooks.org

بھی بلند یاسیت ہے‘‘؟اس نے سوال کیا۔’’مت در بدر پھر، لامحدود عدم ہیں‘‘۔[۱۰۶]

اساطیری فکر اور عمل نے خاتمے اور معدومیت کے امکان کا سامنا کرنے میں اور کسی حد تک رضامندی کے ساتھ اس [امکان] سے ہمکنار ہونے میں لوگوں کی مدد کی۔ اساطیر نہ ہوتیں تو بہت سوں کے لئے مایوسی سے بچ نکلنا مشکل ہوتا۔ بیسویں صدی ہمارے ئے ایک کے بعد ایک عدمیت کے بت لائی اور جدیدیت اور روشن خیالی کی اکثر حد سے بڑھی ہوئی امیدیں باطل ثابت ہوئیں۔ ۱۹۱۲ء میں ٹائی ٹینک کی غرقابی نے ٹیکنالوجی کی ناپائیداری کو ظاہر کیا، پہلی جنگ عظیم سے منکشف ہوا کہ ہماری رفیق سائنس کا اسلحہ سازی پر مہلک اثر کے ساتھ اطلاق کیا جا سکتا، آشوٹز، گُلاگ اور بوسنیا [کی مثالوں سے] عیاں تھا کہ کیا کچھ واقع ہوسکتا ہے جب الوہیت کا پورا مفہوم ہی گم ہوجائے۔ ہم نے یہ جانا کہ عقلی تعلیم نے انسانیت کو بربریت سے نجات نہیں دلائی اور یہ کہ جنگی عقوبت خانہ اسی جگہ موجود ہوسکتا ہے جہاں ایک عظیم یونیورسٹی ہے۔ ہروشیما اور ناگاساکی پر اولین ایٹم بموں کے دھماکوں نے منکشف کیا کہ مذہب واخلاق سے انکار پر مبنی اتلاف ذات کا جرثومہ جدید ثقافت کے قلب میں موجود ہے، اور گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے سے یہ بات سامنے آئی کہ جدیدیت کے ثمرات یعنی ٹیکنالوجی سے سفر کی آسانی اور عالمی رسل ورسائل کو دہشت کے آلات بنایا جاسکتا ہے۔

’’لوگوس‘‘ نے کئی طرح سے ہماری زندگی میں بہتری پیدا کی ہے، مگر یہ مکمل فتح نہیں ہے۔ ہماری اساطیر شکن دنیا ہم میں سے اکثر کیلئے پرآسائش ہے جو اس درجہ خوش قسمت واقع ہوئے ہیں کہ پہلی دنیا کے ملکوں میں رہ رہے ہیں، مگر یہ وہ ارضی جنت نہیں ہے جس کی پیش گوئی بیکن اور لاک نے کی تھی۔ جب ہم بیسویں صدی کی تاریک قوتوں کے ظہور پر تأمّل کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جدید عہد کا اضطراب، نفس پرستانہ عصبانیت (نیوروسیس) کا محض نتیجہ نہیں ہے۔ ہم کسی ایسی شے کا سامنا کر رہے ہیں، جس کی کوئی مثال نہیں۔ دیگر معاشروں نے موت کو ہستی کی دوسری صورتوں کی طرف سفر کا عبوری وقفہ سمجھا۔ [موت اک ماندگی کا وقفہ ہے/ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر] انہوں نے بعد از اں موت کے انتہائی سادہ اور عامیانہ خیالات کی پرورش نہیں کی بلکہ ایسی رسوم اور اساطیر تشکیل کیں جنہوں نے ’’ناقابل گفتار‘‘ کا سامنا کرنے میں لوگوں کی مدد کی۔ کسی دوسری ثقافت میں کوئی شخص، ابتدائی تربیت یا ایک حالت سے دوسری حالت میں تبادلہ کی

رسم کے عین بیچ رک نہیں جایا کرتا تھا، جب کہ خوف ابھی زائل نہ ہوا ہو، مگر یہ وہ سب ہے جو ہمیں قرین فہم اساطیر کی غیر موجودگی میں کرنا پڑتا ہے۔ اسطور کے حالیہ استرداد میں متاثر کن اور ہیرو جیسا زہد ہے۔ لیکن فکر کے خالص مستقیمی، منطقی اور تاریخی طریقوں نے ہم میں سے بہت سوں کو اس چارہ گری اور ترکیبوں سے محروم کر رکھا ہے جو مردوں اور عورتوں کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ ناقابل قبول حالات میں جینے کیلئے اپنی انسانیت کے پورے وسائل کو کام میں لاسکیں۔

ہوسکتا ہے، ہم مادی طریقوں میں پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ ہو گئے ہیں، مگر روحانی طور پر ہم محوری عہد سے آگے نہیں بڑھے، ’مائتھوس‘ کو پسپا کر دینے کی بنا پر الٹا ہم نے معکوس سفر کیا ہے۔ ہم اب بھی اپنے اردگرد کے فوری حالات سے ’’اوپر اٹھنے‘‘ اور ہمہ وقتی بھرپور، تکمیل آشنا وجود میں شریک ہونے کی آرزو کرتے ہیں۔ ہم آرٹ، راک موسیقی، منشیات یا فلم کے زندگی سے بڑے تناظر کے ذریعے اس جہت میں شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم آج بھی ہیرووٗں کی جستجو کرتے ہیں۔ ایلوس پریسلے اور شہزادی ڈایانا دونوں فوری اساطیری ہستیاں بلکہ مذہبی مسلک کا مرکز بنادی گئیں۔ تاہم اس عاجزانہ خوشامد میں کچھ نہ کچھ غیر معتدل ہے۔ ہیرو کی اسطور کا مقصد ستائش کے لئے بت مہیا کرنا نہیں تھا بلکہ انہیں اس طور تشکیل دیا گیا تھا کہ وہ خود ہمارے اندر موجود ہیرو جیسی اعلیٰ خصوصیات کو اخذ کر سکیں۔ اسطورہ کو نقل یا شرکت کے لئے مائل کرنا چاہیے نہ کہ منفعل قسم کے غور و تامل کے لئے، ہمیں اب معلوم نہیں کہ اپنی اساطیری زندگیوں کو کیسے اس ڈھب پر استوار کریں جو روحانی طور پر جرات آزما اور کایا کلپ کرنے والا ہے۔

ہمیں انیسویں صدی کے اس مغالطے کے سلسلے میں اپنا ذہن صاف کر لینا چاہیے کہ اسطورہ جھوٹی ہوتی ہے یا یہ کم درجے کے طرز فکر کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہم مکمل طور پر خود کو از سر نو خلق نہیں کر سکتے، نہ اپنی تعلیم کے عقلی تعصب کا توڑ کر سکتے اور قبل جدید حسیت کی طرف لوٹ سکتے ہیں، مگر ہم اساطیر کے ضمن میں مزید شائستہ طرز عمل اپنا سکتے ہیں۔ ہم اسطور ساز مخلوق ہیں اور بیسویں صدی کے دوران میں ہم نے کچھ بے حد تباہ کن جدید اساطیر دیکھیں جو قتل عام اور نسل کشی پر منتج ہوئیں۔ یہ اساطیر ناکام ہوئیں، کیونکہ وہ محوری عہد کے معیارات پر پوری نہیں اترتی تھیں۔ ان میں دردمندی کا جوہر، ہر طرح کی زندگی کی تقدیس کے لئے احترام یا وہ شے جسے کنفیوشس نے جھکاؤ کا نام دیا ہے، سرایت کیے ہوئے نہیں تھا۔ یہ تباہ کن اساطیر انتہائی نسلی، نسلی گروہی، فرقہ

www.iMashalBooks.org

وارانہ اور انانیت پسندانہ رہی ہیں، یہ خود کو ممتاز بنانے کیلئے دوسروں کو شیطان بنانے کی کوشش تھی، اس طرح کی کسی بھی اسطورہ نے جدیدیت کو ناکام بنایا ہے، جس نے عالمی گاؤں کی تخلیق کی، جس میں تمام بنی نوع انسان اب خود کو ایک ہی طرح کی مشکل اور بری صورت حال میں پاتے ہیں، ہم ان بری اساطیر کا مقابلہ فقط عقل سے نہیں کر سکتے، کیونکہ بے کم و کاست لوگوں ان گہرے، عفریتی خوفوں، خواہشوں اور عصابانیت کا حل پیش نہیں کر سکتی۔ اس ضمن میں اخلاقی اور روحانی طور پر تشکیل دی گئی اساطیر ہی کردار ادا کر سکتی ہیں۔

ہمیں ایسی دیو مالاؤں کی ضرورت ہے جو ہمیں اپنے تمام ہم جنسوں سے خود کو وابستہ تصور کرنے میں مدد دیں نہ کہ محض ان لوگوں سے جو ہمارے نسلی، قومی یا نظریاتی قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہمیں ایسی اساطیر درکار ہیں جو ہمیں دردمندی کی اہمیت کو سمجھنے میں مدد دیں، جسے ہماری عملیت پسند، عقلی دنیا میں پوری طرح مفید اور موثر ہمیشہ نہیں تصور کیا گیا۔ ہمیں ایسی اساطیر چاہئیں جو ہمیں روحانی طرز عمل اختیار کرنے، اپنی فوری ضرورتوں سے آگے دیکھنے میں مدد دیں، ہمیں ماورائی اقدار کا تجربہ کرنے کے قابل بنائیں جو ہماری عندیت [یہ نظریہ کہ وجود صرف اپنی ذات، نفس یا خودی سے وابستہ ہے] پر مبنی خود غرضی کو رد کرتی ہیں۔ ہمیں ایسی اساطیر کی ضرورت ہے جو ہمیں دھرتی کو 'وسیلہ' کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے ایک بار پھر اس کی مقدس شے کے طور پر تعظیم کرنے میں مدد دیں۔ یہ انتہائی اہم ہے، کیونکہ جب تک ایک روحانی قسم کا انقلاب برپا نہیں ہوتا جو ٹیکنالوجی سے متعلق ہماری فطانت کے ہمدوش رہنے کے قابل ہو، ہم اپنے سیارے کو محفوظ نہیں بنا پائیں گے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے ۱۹۳۲ء میں مغربی تہذیب کے روحانی زوال کی تصویر کشی اپنی تاریخ ساز نظم ''دی ویسٹ لینڈ'' میں کی۔ مقدس گریل [وہ پیالہ جو حضرت عیسیٰؑ نے عشائے ربانی کے موقع پر استعمال کیا اور جس میں صلیب کے وقت ان کا خون بھر گیا] کی اسطورہ میں خرابہ (Wasteland) ایک ایسا مقام ہے جاں لوگ اپنے معاشروں کے طور طریقوں کی اندھا دھند تقلید کرتے ہیں، اس عقیدے سے محروم ہیں جو گہرے فہم کا زائیدہ ہے اور یوں جعلی زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ جدیدیت کے ''سنگین انگڑ کھنگڑ'' کو تخلیق کا سرچشمہ بنایا جاتا، جہاں لوگ اپنی ثقافت کی اساطیری اساس سے ناطہ توڑ چکے ہوں؟ لوگ اپنی روایت کے داخلی ارتباط کو سمجھنے کے بجائے، ''فقط شکستہ تمثالوں کے ڈھیر'' کو جانتے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ نے ماضی کی اساطیر، یورپی،

سنسکرت، بدھ، بائبلی، یونانی اور رومی اساطیر کے تیکھے، مختصر، پروقار حوالوں کے ذریعے معاصر زندگی کے بنجر پن کو بے نقاب کیا، اس کی بیگانگیت، بے زاری، عدمیت، توہم، انانیت اور یاسیت کو اس کا راوی مغربی تہذیب کی منڈلاتی ہوئی مرگ کا جب سامنا کرتا ہے تو اس نتیجے پر پہنچتا ہے ''ان ٹکروں سے میں نے اپنی بربادیوں کے مقابل آڑ کھڑی کی ہے''۔ ماضی کی شکستہ بصیرتیں جنہیں اس نظم میں یکجا کیا گیا ہے۔ ہمیں خطرے سے نکال سکتی ہیں۔ ان بصیرتوں کو یکجا کرنے اور ان کی مشترکہ اساس کو پہچاننے کے بعد ہم اس خرابے کی اصلاح کر سکتے ہیں، جس میں ہم رہتے ہیں۔

ایلیٹ کی نظم پیغمبرانہ تھی۔ مذہبی راہنماؤں کے بجائے یہ ادبا اور فنکار تھے، جنہوں نے اس خلاء کو پر کیا اور ہمیں ماضی کی اساطیری دانش سے ازسرنو واقف کرنے کرانے کی سعی کی۔ مثال کے طور پر مصوروں نے جدیدیت کے بعض پہلوؤں کے بنجر پن اور بے رحمانہ ظلم کا تریاق تلاش کرنے کی کوشش میں اساطیر نفس ہائے مضامین کی طرف رجوع کیا۔ ۲۶ اپریل ۱۹۳۷ء کو جب ہسپانوی خانہ جنگی عروج پر تھی، جنرل فرانکو کے احکامات کے تحت نازی جہازوں نے گیورنسکا کے دارالحکومت باسک پر، جب بازار لگا تھا، حملہ کیا، جس میں اس شہر کے ۷۰۰۰ باسیوں میں ۱۶۵۴ لقمہ اجل بن گئے۔ چند مہینوں کے بعد پابلو پکاسو نے پیرس کی بین الاقوامی نمائش میں ''گیورنکا'' نمائش کیلئے رکھی۔ اس جدید سیکولر تصلیب نے اس کے معاصرین کو دہلا کے رکھ دیا، تاہم ''ویسٹ لینڈ'' کی طرح یہ ایک پیغمبرانہ اظہار تھی نیز ہماری نئی جری دنیا کے وحشیانہ پن کے خلاف اجتماعی چیخ تھی۔

یہ مصوری ہے، جس سے دردمندی یعنی دوسروں کے کرب کو محسوس کرنے کی صلاحیت جھلک رہی ہے۔ قربانی بعض ابتدائی اساطیری مفروضات کا محرک بنی تھی۔ ابتدائی حجری دور میں بنی نوع انسان نے ان جانوروں سے اضطراب انگیز خونی رشتہ محسوس کیا تھا جنہیں وہ شکار کرتے اور مار ڈالتے تھے۔ انہوں نے اپنی شروعاتی غم انگیزی کو قربانی کی رسومات میں ظاہر کیا، جس میں ان جانوروں کی تکریم کی جاتی جو انسانیت کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے تھے۔ ''گیورنکا'' میں انسان اور جانور جنہیں کسی امتیاز کے بغیر اندھا دھند تہ تیغ کیا گیا، اکٹھے بگڑے ہوئے حلیوں کے ساتھ ڈھیر کی صورت میں پڑے ہیں اور چنگھاڑتا ہوا گھوڑا بھی ہے جو کٹے ہوئے سر والی انسانی شبیہات سے سخت الجھے ہوئے انداز میں لپٹا پڑا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی تصلیب کی بے شمار تمثیلوں میں، صلیب کے قدموں میں عورتوں کا دھیان لاتے ہوئے [مذکورہ تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ] دو

عورتیں زخمی گھوڑے پر نظر جمائے ہوئے ہیں اور اس کے درد کو تاسف کے ساتھ شدت سے اپنے درد کی طرح محسوس کر رہی ہیں۔ قبل جدید سماج میں مادر عظمیٰ ایک کٹھور شکاری تھی، مگر پکاسو کی تصویر میں ماں، جس نے اپنے مردہ بچے کی ڈھلکی ہوئی لاش اٹھائی ہے، خود شکار بنی ہے اور دبے دبے انداز میں چنگھاڑ رہی ہے۔ اس کی پشت پر ایک بیل ہے، جس کے بارے میں پکاسو نے کہا کہ وہ بربریت کی نمائندگی کرتا ہے۔ پکاسو کو ہمیشہ بیلوں کی دھوم دھامی لڑائی لبھاتی تھی جو ہسپانیہ کا قومی کھیل ہے اور جس کی جڑیں عہد عتیق کی قربانی کی رسوم میں ہیں۔ پکاسو کا بیل وحشی نظر نہیں آتا، وہ دوسرے زخم خوردوں کے ساتھ کھڑا ہے، زناٹے سے اپنی دم ہلاتے اور منظر کا جائزہ لیتے ہوئے۔ شاید اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بیلوں کی لڑائی میں وہ لمحہ ہے، جب ایک بیل لڑائی ترک کر کے پیچھے جا کھڑا ہوتا ہے تا کہ اپنے اگلے اقدام کے بارے میں سوچ سکے۔ لیکن بربریت کی علامت بیل [یہاں] خود کشتہ قربانی ہے اور اسے پھٹکارا گیا ہے۔ پکاسو شاید اس جانب اشارہ کر رہا ہے کہ بس جدید انسانیت یہی ہے، جس نے (اگرچہ پکاسو اس سے بے خبر تھا) اپنی خودشکنی اور عقلی سوچ بچار سے پیدا ہونے تشدد کے تمام تر امکانات کی دریافت کا بس آغاز کیا تھا۔

ناول نگاروں نے بھی جدید عہد کے مخمصے کی دریافت کیلئے اساطیر سے رجوع کیا ہے۔ ہمیں صرف جیمس جوائس کے ''یولی سس'' کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہے جو اسی سال شائع ہوا جب ''ویسٹ لینڈ'' منظر عام پر آئی۔ اس میں جوائس کے مرکزی کرداروں کا تجربہ، ہومر کی ''اوڈیسی'' کے واقعات سے مطابقت رکھتا ہے۔ خورخ لوئی بورخیس، گنتر گراس، اطالو کیلو نیو، انجلا کارٹر اور سلمان رشدی جیسے طلسماتی حقیقت نگارون نے، حقیقت پسندی کی 'نا قابل تشریح' سے اور روزمرہ کی عقل کو خواب اور پریوں کی کہانی کی اساطیری منطق سے آمیز کر کے لوگوس کے اجارے کو مسترد کیا ہے۔ دیگر ناول نگاروں نے مستقبل میں جھانکا ہے۔ جارج آرول کا ''نائن ٹین ایٹی فور'' (۱۹۴۹) پولیس سٹیٹ کے خطرات سے خبر دار کرتا ہے، جس میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول ہے اور ماضی کی مستقل طور پر قطع و برید کی جاتی ہے تا کہ وہ حال کے لئے موزوں ہو۔ آرول کے پیغام کے ٹھیک ٹھیک مضمرات پر کافی بحث ہوئی ہے، مگر ماضی کی عظیم دیو مالاؤں کی مانند یہ مقبول عام شعور کا حصہ بن چکا ہے۔ اس کے بہت سے فقرے اور تمثالیں، اس کے عنوان سمیت عام گفتگو میں شامل ہو گئے ہیں، بگ برادر، ڈبل تھنک، نیوز پیک اور روم ۱۰۱ آج بھی جدید زندگی

کے رجحانات اور خصوصیات کو پہچاننے کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان لوگوں کی زبان سے بھی جنہوں نے یہ ناول کبھی نہیں پڑھا۔

لیکن کیا ایک سیکولر ناول واقعی روایتی اسطورہ کا، اس کے دیوی دیوتاؤں سمیت، اعادہ کر سکتا ہے؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قبل جدید دنیا میں الوہیت کو شاید ہی ان مابعدالطبیعیاتی معانی میں لیا گیا ہو جو مغربی لوگوس نے مسلط کیے، اس کے بجائے سے لوگ عموماً اپنی انسانیت کو سمجھنے کیلئے بروئے کر لاتے تھے۔ جیسے جیسے لوگوں کے حالات تبدیل ہوئے، دیوتا اکثر پسپا ہوتے گئے، اساطیر اور مذہب میں وہ حاشے پر چلے گئے اور بعض اوقات وہ سرے سے غائب ہو گئے۔ ہمارے زمانے کے ناولوں کی بے خدا اساطیر میں کوئی نئی بات نہیں ہے جو اسی طرح انسانی صورت حال کے بے قابو اور گریز پا مسائل سے نپٹتی ہیں، جیسے قدیم زبانوں کی اساطیر نبٹتی تھیں اور ہمیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ دیوتاؤں کی خواہ کوئی حیثیت ہو بنی نوع انسان اپنے مادی حالات کے قیدی نہیں ہیں اور یہ کہ سب کچھ مقدس، دیوتائی قدر کا حامل ہے۔ چونکہ ناول نگار اور فن کار شعور کی اسی سطح پر کام کر رہے ہوتے ہیں جو ان میں اور اسطور سازوں میں مشترک ہے، اس لیے وہ فطری طور پر یکساں موضوعات سے رجوع کرتے ہیں۔ جوزف کونریڈ کے ''قلب ظلمات'' (Heart of Darkness) کو سورمائی تلاش اور ابتدائی تربیت کی مشق کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جو اپنی اصلی راہ سے بھٹک گئی ہے۔ ۱۹۰۲ء میں، مغرب کے اپنے عظیم واہمے سے چھٹکارا پانے کا آغاز کرنے سے ذرا پہلے، شائع ہونے والا یہ ناول حد سے بڑھے ہوئے مہذب مسٹر کرٹز کے افریقی جنگل کے قلب میں عارضی قیام کو بیان کرتا ہے۔ روایتی اسطوریات میں ہیرو سماجی دنیا کے تحفظ کو پیچھے چھوڑ آتا تھا۔ اکثر زمین کی گہرائیوں میں اترنا پڑتا جہاں اس کا سامنا خود اپنی ذات کے کسی غیر متوقع پہلو سے ہوتا۔ علیحدگی اور بے درست و پائی کا تجربہ، نفسیاتی شکست و ریخت پر منتج ہوتا، جس سے نئی حیات آفریں بصیرت پیدا ہوتی۔ اگر ہیرو کامیاب ہو جاتا تو اپنے لوگوں میں کچھ نئی اور بیش بہا شے سمیت لوٹ آتا۔ کونریڈ کے ناول میں پر پیچ برے شگون والے افریقی دریا، لاساؤکس کی زیر زمین سرنگوں کی یاد دلاتے ہیں، جن میں نو وارد واپس دھرتی کی کوکھ میں رینگتے ہوئے جاتے تھے۔ کرہ ارض کے ابتدائی جنگل کی زیر زمین دنیا میں، کرٹز بلا شبہ اپنے قلب کی ظلمت میں جھانکتا ہے، مگر اپنی رجعت سے پیوستہ رہتا ہے اور روحانی طور پر مر جاتا ہے۔ وہ بنتے بنتے رہ جانے والا شمن

www.MashalBooks.org

ہے، جس کی کوئی توقیر نہیں، بلکہ جس افریقی سماج سے برابرتاؤ کرتا ہے، اس سے نفرت کرتا ہے۔ اسطوری ہیرو نے یہ سیکھا تھا کہ اگر وہ خود اپنے لئے مر گیا تو اسے حیات نو ملے گی، مگر کرٹز بانجھ انانیت کی مشقت میں گرفتار ہے اور جب وہ انجام کار ناول میں سامنے آتا ہے تو ایک زندہ لاش کے بے ہودہ پن کا حامل ہوتا ہے۔ خود اپنی شہرت کے طلسم میں گرفتار کرٹز کو اعلیٰ، ارفع کردار کی نہیں بلکہ بنجر قسم کی دھوم دھام کی جستجو ہے۔ وہ زندگی کا ہیرو کی طرح کا اثبات نہیں کرسکتا، مرتے ہوئے اس کے الفاظ یہ تھے: ''دہشت، دہشت!'' ٹی ایس ایلیٹ نے کرٹز کے آخری لفظوں کو ''دی ویسٹ لینڈ'' کی تمہیدی عبارت بنایا، کونریڈ ایک سچے پیغمبر کی طرح پہلے ہی بیسوی صدی کی فرسودگی، خودغرضی، ہوس، عدمیت اور یاسیت کا مشاہدہ کر چکا تھا۔

ٹامس مان نے بھی ''کوہ طلسمات'' (The Magic Mountain) (مطبوعہ ۱۹۶۴ء) میں ابتدائی تربیت کے موتیف کو استعمال کیا، جو مغربی تاریخ کے ایک اور المیہ صورت حال کے دوران میں واقع ہوتا ہے۔ اس نے اعتراف کیا کہ یہ اس کی اصل منشاء نہیں تھی، مگر جب ہاورڈ کے ایک نوجوان سکالر نے نشاندہی کرتے ہوئے اسے بتایا کہ ناول ''متلاشی ہیرو'' کی جدید مثال ہے تو اس نے فوراً محسوس کرلیا کہ واقعی ایسا ہی تھا۔ ہیرو کی تلاش کی اسطوریات اس کے تحت الشعور میں پیوست تھی اور اس نے اس تک رسائی حاصل کی، یہ جانے بغیر کہ اس نے کیا کیا ہے۔ مان کے ناول کے ڈیووس سنی ٹوریم کو 'ابتدائی تربیت کی رسومات کا معبد، زندگی کے اسرار کی مہم جویانہ کھوج کا مقام'' بننا تھا۔ اس کا ہیرو ہانس کیسٹارپ (Hans Castorp) ''مقدس پیالے'' کا متلاشی ہے جو علم، دانائی اور تقدیس کی علامت ہے اور جس سے زندگی میں معنی پیدا ہوتے ہیں۔ کیسٹارپ رضا کارانہ طور پر بیماری اور موت کو گلے لگاتا ہے، کیونکہ ان سے اس کا اولین رابطہ غیر معمولی بڑھوتری کی نوید لاتا ہے جو بلاشبہ جواباً عظیم خطرات سے گھرا ہے''۔ تاہم اس کے ساتھ ہی یہ جدید ''ابتدائی تربیت'' بیسویں صدی کی دیرینہ فرسودگی میں شریک ہے۔ مان نے سینٹی ٹوریم میں مریضوں کو ''علیحدگی اور انفرادیت پسندی کا پر افسوں دائرہ'' بناتے دیکھا۔ جہاں روایتی طالب اپنے معاشرے کو نفع پہنچانا چاہتا تھا، کسٹارپ عندیت [یہ نظریہ کہ وجود صرف نفس یا خودی سے عبارت ہے] پر مبنی، طفلی اور انجام کار بے سمت تلاش میں مبتلا ہے۔[۱۰۷] وہ اپنے کوہ طلسمات پر انسانیت کا خواب کبیر دیکھتے ہوئے سات سال صرف کرتا ہے، محض اس لیے کہ پہلی جنگ عظیم میں جان

سے جا سکے۔ اسے یورپ کی اجتماعی خودکشی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

میلکم لاؤری کا ''آتش فشاں کے نیچے'' (Under the Valcano) (۱۹۴۷ء) میں میکسیکو کی فضا ہے جب دوسری جنگ عظیم سر پر کھڑی تھی۔ اس میں کونسول، جو ایک شرابی ہے، کی زندگی کے آخری دن کا خاکہ کھینچا گیا ہے، جو نہ صرف خود لاؤری، بلکہ...... یہ واضح کر دیا گیا ہے...... ہر شخص کا نفس ناطقہ ہے۔ کتاب کی ابتداء ''کینٹینا ڈیل باسک'' (Cantina del Basque) سے ہوتی ہے، جسے مردوں کے دن دانتے کے جہنم کے ''تاریک جنگل'' کی یاد آتی ہے، جب مرحومین کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ وہ زندوں سے راز و نیاز کر سکیں گے، پورے ناول میں لاؤری اس قدیم اساطیری بصیرت کو تلاش کرتا ہے جو زندگی اور موت کو اٹوٹ سمجھتی ہے۔ یہ ناول بھری پری زندگی اور میکسیکو کے دلفریب مناظر......ایک طرح کا باغ عدن......کو موت اور ظلمت کی جہنمی تصویروں کے بالمقابل مسلسل پیش کرتا ہے۔ نظر بہ ظاہر معمولی تفاصیل آفاقی معنی حاصل کر لیتی ہیں۔ لوگ طوفان سے اسی طرح پناہ لیتے ہیں، جس طرح جنگ کے شکار لوگ پوری دنیا میں ہوائی حملوں سے پناہ کیلئے چھپتے ہیں، سنیما کی بتیاں اسی طرح گل ہو جاتی ہیں، جیسے یورپ تاریکی میں گم ہو رہا ہے۔ Las Manos de Orlac نامی فلم کا اشتہار، جس میں ہاتھ پر خون کے دھبے لگے ہیں، ہمیں انسانیت کے اجتماعی جرم کی یاد دلاتا ہے، فیرس کا پہیہ [ہنڈولا جس کے عمودی شکل میں گھومنے والے چکر میں نشستوں کیلئے خانے لٹکے ہوئے ہیں، جو اوپر نیچے حرکت کرتے ہیں] وقت کی گزران کی علامت ہے، سڑک کنارے جاں بلب کسان ہمیں کرہ ارض کے ان تمام لوگوں کی یاد دلاتا ہے جو بے خبری کی موت مر رہے ہیں۔ جب کونسول مزمن طور پر نشے سے مخمور ہوتا ہے تو اس کے اردگرد کی فضا واہموں کی شدت سے بھر جاتی ہے، جس میں واقعات اور اشیاء اپنی انفرادیت کو عبور کر جاتے ہیں، عہد عتیق کی اساطیر میں ہر شے کی مقدس معنویت تھی اور کوئی ایک شے یا عمل بھی بیگانہ مذہب نہیں تھا۔ لاؤری کے ناول میں جیسے جیسے ''مُردوں کا دن'' آگے بڑھتا ہے، کوئی شے مبہم نہیں رہ جاتی، ہر شے فیصلہ کن معنویت سے معمور ہوتی ہے۔

یہ ناول ۱۹۳۹ء سے پہلے کی دنیا کی نشے میں غرقابی کی تصویر پیش کرتا ہے۔ نشے کا ہر گھونٹ جو کونسول لیتا ہے، اسے اٹل موت کے ایک قدم قریب لے جاتا ہے، کونسول کی مانند، انسانیت قابو سے باہر ہے اور ڈگمگاتے ہوئے تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ خواہش مرگ میں گرفتار، یہ زندگی اور

www.MashalBooks.org

روشن بصیرت کی صلاحیت سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ قبالہ اس عارف کا موازنہ، جو اپنی قوتوں کا غلط استعمال کرتا ہے، عادی نشہ باز سے کرتا ہے۔ یہ تمثال ناول میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے: ایک جادوگر کی طرح جو اپنا راستہ گم کر چکا ہے، بنی نوع انسان نے اپنی قوتوں کو بے مہار کر دیا ہے جنہیں وہ قابو میں نہیں لا سکتے اور جو بالآخران کی دنیا تباہ کر دیں گی۔ تاہم یہ ناول بذات خود ہر شے کے وجود سے انکار کا حامل نہیں، رقت آفرینی، جمال اور انسانیت کی قابل محبت لغویت کو ابھارنے کی صورت میں اس میں گہری دردمندی موجود ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسطورہ تک رسائی خالص دنیوی، غیر مذہبی فضا میں حاصل نہیں کی جا سکتی، یہ اپنے اجتماعی عبادت کے تناظر میں قابل فہم تھی جو اسے روزمرہ زندگی سے الگ کرتا ہے، اس کا تجربہ شخصی کایا کلپ کے عمل کے حصے کے طور پر ہی کیا جانا چاہیے۔ بلاشبہ ان میں کسی شے کا اطلاق ناول پر نہیں ہوتا، جسے کہیں بھی یک سر رسوماتی لوازمات کے بغیر پڑھا جا سکتا ہے اور سے اگر کسی قابل ہونا ہے تو لازماً برملا طور پر ناصحانہ ہونے سے گریز کرنا چاہیے۔ تاہم مطالعہ ناول کے تجربے کی کچھ خوبیاں ہیں جو ہمیں اسطوریات کے روایتی فہم کی یاد دلاتی ہیں اسے مراقبے کی ایک صورت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ قارئین کو ناول کے ساتھ کئی دنوں یا ہفتوں تک رہنا ہوتا ہے۔ یہ انہیں ایک اور دنیا میں لے جاتا ہے جو معمول کی زندگیوں کے متوازی مگر ان سے مختلف ہوتی ہے۔ انہیں خوب اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانوی قلمرو 'حقیقی' نہیں ہے، اس کے باوجود جب وہ اس کا مطالعہ کر رہے ہوتے ہیں، یہ توجہ کو اپنی طرف کھینچتا اور خود کو سراہنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایک پراثر ناول کو پڑھنے کے بعد جب ہم اسے ایک طرف ڈال دیتے ہیں تو مدت بعد وہ ہماری زندگیوں کے پس منظر کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ مغالطے کی ایک مشق ہے جو یوگا یا مذہبی جشن کی طرح زمان و مکان کی رکاوٹوں کو شکستہ کرتی ہے اور ہماری ہمدردیوں کو وسیع کرتی ہے تاکہ ہم دوسری زندگیوں اور غموں سے ذہنی موافقت قائم کرنے کے قابل ہو سکیں۔ یہ ترحُّم کی تعلیم دیتا ہے، یعنی دوسروں کے ساتھ محسوس کرنے کی صلاحیت۔ نیز اساطیر کی مانند ایک اہم ناول کایا کلپ کرنے والا ہوتا ہے۔ اگر ہم اسے ایسا کرنے کی اجازت دیں تو یہ ہمیں ہمیشہ کیلئے تبدیل کر سکتا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اساطیر آرٹ کی ایک صورت ہے۔ پراثر آرٹ کا کوئی بھی نمونہ ہمارے وجود پر چھا جاتا ہے اور اسے سدا کے لئے بدل دیتا ہے۔ برطانوی نقاد جارج سٹائنز کا دعویٰ

ہے کہ مذہبی اور مابعدالطبیعیاتی تجربے کی کچھ قسموں کی طرح، آرٹ انتہائی ''اندر اتر جانے والا'' قلب ماہیت کرنیوالا بلاوا ہے جو اثر پذیری کے حامل انسانوں کیلئے ہے''۔ یہ مداخلت پسند، جارحانہ لغزش ہے جو ''ہمارے وجود کے حتمی رازوں کی کھوج کرتی ہے''۔ ایک بشارت [Annunciation حضرت جبرئیلؑ کا حضرت مریمؑ کو حضرت عیسیٰؑ کی بشارت] ہے جو ''ہماری احتیاط پسند ہستی کی معمولی اقامت گاہ میں در آتی ہے''، اس طور کہ ''ہم اس میں پہلے کی طرح قیام نہیں کر سکتے''۔ یہ ماورائی آمنا سامنا ہے جو اصل میں ہمیں بتاتا ہے: ''اپنی زندگی بدلو''۔[۱۰۸]

اگر ناول کو گہرے دھیان سے لکھا اور پڑھا گیا ہو تو اسطورہ یا آرٹ کے کسی بھی عظیم تخلیق کی طرح ''ابتدائی تربیت'' ثابت ہو سکتا ہے جو ہمیں مدد دیتی ہے کہ ہم اسے زندگی کی ایک منزل سے دوسری منزل، ذہن کی ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقلی کی دشوار رسم بنا سکیں۔ اسطورہ کی طرح ناول ہمیں دنیا کو مختلف انداز میں دیکھنے کی تعلیم دیتا ہے، یہ ہم پر واضح کرتا ہے کہ ہم خود اپنے دلوں میں کیوں کر جھانکیں اور کیسے اپنی دنیا کو اس تناظر میں دیکھیں جو ہمارے ذاتی مفاد سے بالاتر ہے۔ اگر پیشہ ور مذہبی رہنما ہمیں اساطیری معارف کی تعلیم نہیں دے سکتے تو ہمارے فنکار اور تخلیقی مصنفین شاید اس مرشدانہ کردار کے قائم مقام بن سکتے اور ہماری بھٹکی ہوئی اور شکستہ دنیا کو تازہ بصیرت دے سکتے ہیں۔

☆☆☆

www.MashalBooks.org